

ۛ

قواعد رسالہ نگار

- ۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے
- ۲ رسالہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
- ۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جبکہ نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دئے جاتے ہیں
- ۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
- ۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئے
- ۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

تقدیر صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پارہ صفحہ	نرخ نامہ اجرت اشتہارات	تقدیر صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پارہ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصد کمییشن دیا جائیگا (۳) اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۳ روپیہ		ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

نگار نگار کیسے لکھو

نگارستان	گوارہ تمدن	شہاب کی سرگزشت	فرست المید	شاعر کا انجام	صحابیات
(دوسرا ڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں	(دوسرا ڈیشن) نولانا نیاز کی وہ معرکہ آرا کتاب حسین تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے	حضرت نیاز کا وہ عظیم نظیر افسانہ جو اردو زبان میں نکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی فضا عالیہ سحر محال کے درجہ تک پہونچتی ہے	مولفہ نیاز فیمینیری جس کے مطالعہ سے ایک شخص سانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت بیماری شہرت نیکنائی وغیرہ متعلق صحیح پیش گوئی کر سکتا ہے	جناب نیاز کے عقلمان شہاب کا لکھا ہوا فسانہ حین عشق کی تماشائے بخش کیفیات اسکی ایک جلد میں جو وہیں علاوہ محصول ۱۲	جس میں سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات کیج کر دیے گئے ہیں اسکا مقدمہ نواز خاص اپنی انشائیہ لکھا، قیمت علاوہ محصول ۱۲
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکی متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔	۱۰ روپیہ بالکل سلی	۱۰ روپیہ بالکل سلی	۱۰ روپیہ بالکل سلی	۱۰ روپیہ بالکل سلی	۱۰ روپیہ بالکل سلی

روزنامہ ناخدا کو اجاب کا انتظام ہو رہا ہے
بسم اللہ
منکار

سابقہ تہذیب اور انتشار فرما رہا ہے
شمار ۶

جلد ۲۰ فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء

۲۰	ملاحظات
۹	مسلمانوں کے قومی انتشار و فطانت کا اصل راز ————— عبد المالک آروی
۲۹	بالشویک شاہزادی ————— طالب باغبینی
۵۰	کار و بار کی موجودہ سردبازاری کے اسباب ————— محمد عاقل ایم۔ اے
۵۶	شبنمستان کا قطرہ گوہریں
۶۴	وقت و زمان کی حقیقت
۷۲	صحافت مغرب کی حیرت ناک داستان
۷۸	علوم ریاضیہ کی اہمیت
۸۱	باب الاستفسار
۸۹	اعتبارات
۹۱	وطن (نظم) ————— قیصر
۹۲	خدا کی جلوہ گاہیں (نظم) ————— اظہر
۹۳	حدیث دوست (نظم) ————— عدم
۹۴	بیان مجبور (نظم) ————— حیرت
"	واردات (نظم) ————— خلیق
۹۵	معلومات

نگار

جلد ۲ دسمبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۶

ملاحظات

اے بہ خلا و ملاخوئے تو ہنگامہ زنا
باہمہ در گفتگو، بے ہمہ در ماجرا

اے خدا، اُس وقت بھی کہ قرون مظلمہ کی دنیا تجھے صرف غصہ کی آگ برسانے والا دیتا سمجھ رہی تھی،
مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و رافت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے
اول دن سے میں ڈرایا جا رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا تو، تو خفا ہو جائے گا، ایسا نہ کیا تو، تو براہم ہو کر مجھے آگ
میں ڈال دے گا، لیکن میں نے تجھے قلب کی گہرائیوں، اپنی روح کے اعماق میں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا
ٹھیک اس وقت کہ لوگ تیرے غصہ کے اندیشہ سے کانپتے ہوئے تھے، میں تیری محبت و شفقت کے حضور
میں سکون کے ساتھ تیری تعریف کے گیت گایا کرتا تھا۔ وہ روتے تھے میں ہنستا تھا، وہ تیرے سامنے جھکتے تھے تجھ
سے ڈر کر، اور میں تیرے حضور میں سر بہ سجود ہوتا تھا تیری محبت سے بیتاب ہو کر
دلے دارم خراب از التفات چشم بہارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بیارت

ایک زمانہ گزر گیا کہ اس کارگاہ عالم میں، اُن کا خوف اور میری محبت دونوں اسی طرح متوازی چلتے رہے نہ اُن

میں یہ جرات کہ میری محبت کی آنکھوں سے تیرے متبسم و درخشاں چہرے کا نظارہ کرتے، نہ مجھ میں اس کا ہوش کہ اُن کے آئینہ خوف میں تیری پیشانی کی شکنوں کو دیکھتا۔ اُن گزرتے گئے، آفتاب کے طلوع و غروب کے نہ جانے کتنے مناظر میرے دل میں تیرے حسن مجرد کے نقوش قائم کرتے رہے، چاند کے عروج و زوال کی مختلف منزلوں میں تو ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے تجھے کس کس آن میں دیکھا، بہار و خزاں کی متضاد کیفیات میں، کسے خبر ہے کہ میں نے تیری شیریں نکمت کو کس کس طرح سونگھا، دریاؤں کی روائی میں، پہاڑوں کے سکوت میں، آبشاروں کے شور میں، جنگل کے سناٹے میں، قصر دولت کے محلیں فرش پر، غربت زدہ جھوپڑوں کی بوسیدہ چٹائیوں پر، خواجگان کبار کی چپیں ابرو میں، کاسیان ضعیف کی عرق آلود پیشانی میں، امیروں کے زرکار لبادوں میں، کسانوں کے تارتار کرتوں میں۔ الغرض اسے اعداد و شمار سے باہر، اسے زمان و مکان کی قید سے آزاد، میں نے ہر جگہ تجھی کو کار فرما دیکھا اور جہاں دیکھا شفقت و رافت کے لاکھوں پھول برساتا ہوا

میں حیران تھا کہ دنیا والے تجھ سے ڈرتے کیوں ہیں، محبت کیوں نہیں کرتے، تیری ہیبت کیوں اُن کے دلوں پر طاری ہے، تیری رحمت سے الفت کرنے پر کیوں مجبور نہیں۔ اس حال پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، اور میں خاموش پروانہ وار تیری شمع حسن کا طواف کرتا رہا۔ ایک دن ناگہاں تجھ سے ڈرنے والوں میں سے ایک ڈرنے والا میرے پاس آیا اور بولا کہ چل ہمارے معبد میں ہمارے خدا کی جستجو کرو، میں بولا تمہارا معبد! تمہارا خدا! کیا وہی معبد جسے آسمان کا صاعقہ، زمین کا زلزلہ مسمار کر دے سکتا ہے کیا وہی خدا جس کے تصور کی ابتدا خوف و ہراس سے ہوتی ہے مجھے نہ پہچانتے نہ وہ۔ میرا معبد میرے دل کے اندر ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی میرا خدا میری روح کے اندر۔ محبت کا زریں نقاب ڈالے ہوئے جملگار ہا ہے۔

پھر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ایک بے آب و گیاہ قطعہ زمین سے رونما ہونے والی ہستی نے مجھ سے کہا کہ چل ہماری پرستش گاہ میں، خدا کی پرستش کرو۔ میں نے پوچھا وہ پرستش گاہ کیسی ہے اور وہ خدا کیسا ہے۔ جواب ملا "وہ معبد کسی مکان میں مقید نہیں، بلکہ انسان کے ہر سجدہ کے ساتھ از خود پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ خدا ایک محبت و شفقت ہے جو میرے ذریعہ سے تمام دنیا کے بسنے والوں کو اپنی رحمت کا پیام دینا چاہتا ہے۔"

میں فرط مسرت سے اچھل پڑا، لاکھوں برس کے انتظار کے بعد وہ آواز کان میں آئی جس کے لئے روح بیتاب اور دل دیوانہ تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اس کے سامنے اپنا دل ڈال دیا، اس کے دامن سے اپنا دامن باندھ دیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میری ہستی اس کی ہستی کا ایک جزو ہو کر سکون کے شیریں خواب میں محو ہو گئی

غالب نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ۔ ملتیں جب مشکائیں اجزاء ایماں ہو گئیں۔ پھر یہ بات نہ محراب و منبر کی ہے کہ مجھ سارند معصیت کو ش اسے نہ کہہ سکے، نہ حدیث دارورسن ہے کہ میرا ضعیف قلب اسکے اظہار سے خائف ہو۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی پیشین گوئی ہے جسکو میری نگاہیں ابھی سے دیکھ رہی ہیں۔ اور ہر چند اس وقت میں نہ ہونگا، لیکن جو ہوگا وہ دیکھ لیا کہ آخر کار نوع انسانی اس ایک مرکز پر جمع ہو کر رہی جسے آجکل کی اصطلاح میں نہیں بلکہ مستقبل کی اصطلاح میں سچے مذہب کے نام سے پکاریں گے کیونکہ وہ عبارت ہوگا محض انسانیت سے جسکی سب سے پہلے اسلام نے دعوت دی اور آخر میں بھی وہی اسکو انجام تک پہنچانے والا ثابت ہوگا۔

دنیا میں کوئی چیز بذات خود نہ بری ہو نہ اچھی۔ اس سے اچھالی یا برائی کا تعلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اسکا استعمال کیا جائے پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہو تو اسکی تعریف کی جاتی ہے، ورنہ برائی۔ ایک ننگے دھڑکے ہوئے کا گڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اگر اسی سے زخم ہو نچایا جانے لگے تو لوگ اسکو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے تیغ و تفتک اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں، لیکن انکے استعمال کی تاریخ اسقدر نو نہیں ہے کہ لوگ اسکو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بسایا جاتا، تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہوتا کہ بندوق کی کوئی انسانی سینہ گے اندر داخل ہو سکتی ہے اور لوگوں کی دھار انسان کے اعضا کو قطع کر سکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دنیا کی ان تمام تحریکوں کی ہے جنکو اصطلاح نوع انسانی اور قیام امن و سکون کے لئے بروئے کار لایا گیا ہے جب تک ان سے مقصد اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ رہے اور جب انکی حقیقی روح مفقود ہو گئی تو لوگوں نے ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ مردہ ہو کر رہ گئیں۔ دنیا سے اصلاح اخلاق میں سے بڑا مرتبہ مذہب کا سمجھا جاتا ہے، یعنی کوئی تحریک دنیا میں قیام امن و سکون کے نام سے ایسی پیش نہیں کی گئی جسکا نام مذہب نہ رکھا گیا ہو۔ لیکن جب آپ اسکی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مذاہب عالم خواہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے کتنے ہی امن پسند کیوں نہ ہوں، لیکن تاریخی حیثیت سے، انکی خوزیریاں و خول آشامیاں، نوع انسانی کے مصائب کی نہایت دردناک داستانیں ہیں۔ یقیناً اس سے زیادہ حیرتناک امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو مذاہب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے قتل و غارتگری و جنت و دوزخ کی مثالیں آئے ہیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں کے متبعین نے دنیا میں خوزیریاں کیں اور مذاہب ہی کا نام لے لے کر قتال و جدال کا بازار گرم کیا گیا۔ یقیناً ایک سوچنے والے دماغ کے لئے یہ مسئلہ بڑی الجھنیں پیدا کرنے والا ہے اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اس سے وہ کس نتیجہ پر پہنچے آیا یہ کہ مذہب کا خیال ہی دنیا میں ایک لغو خیال ہے یا یہ کہ واقعی دنیا سے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔ اس حقیقت پر نگار کے صفحات میں بار بار روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے اور نوع انسانی کی ترقی کے لئے کسی ایسے نظام کا قائم ہونا جو امن و سکون کی بقا اور اخلاق کے قیام کا ضامن ہو، خود انسان کی فطرت کا اقتضا، تھا خواہ اس کا نام مذہب رکھا جائے یا کوئی اور۔ اسلئے اس پر بحث کرنا صرف لغوی نزاع ہوگی کہ اس کا نام مذہب کیوں رکھا گیا، کسی اور نام سے کیوں نہ موسوم کیا گیا۔ بہر حال فی نفسہ مذہب کی ضرورت

یا اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لامحالہ ہم کو دوسری صورت پر غور کرنا پڑے گا کہ کیا واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔ — لفظ مذہب کا مفہوم طریق حیات یا طریق عمل ہے جو اپنی جگہ کس قدر معصوم معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ہم اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی معصوم لفظ دنیا میں کتنی خوریزوں اور معصیت کو شیوں کا سبب بنا اور وہی چیز جس کو پیام امن و نجات کی صورت سے ہمیشہ پیش کیا گیا، اسے کتنا ہنگامہ فتنہ و فساد عالم میں برپا کیا۔ لیکن آپ جس وقت جنگوں کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک حقیقتاً دنیا میں کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہب کے نصب العین سے منسوب کیا جاسکے یا کسی مذہب نے اسے روار کھا ہو۔ بلکہ تمام لڑائیاں صرف ہوس ملک گیری کی بنا پر قائم ہوئیں، یا خود غرضی یا نفسانی خواہشات پر۔ پھر یہ تو ہوا کہ بعض اہل مذہب نے محض مدافعت و حفاظت کے لئے واقعی خلوص و صداقت کے ساتھ اسلحہ اٹھائے، لیکن جارحانہ جنگ کوئی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہبی ضرورت کی صورت میں پیش کیا جاسکے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اسے اپنی عسکریت کی نمائش اسی وقت کی، جب افت و حفظ نفس کے خیال نے ان کو اس کے لئے مجبور کر دیا، یا طاغوتی قوتوں نے دنیا کے امن و سکون کو خراب کرنا چاہا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دنیاوی اعراض کے لئے اسلام نے کسی کا خون بہایا ہو، پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا انسانی خود غرضی اور نفس پرستی کی اس سے زیادہ کوئی مکروہ مثال مل سکتی ہے کہ اس نے جنگ تو کی ہمیشہ اسباب عیش و تنعم فراہم کرنے کے لئے، جاہ و ثروت، دولت و حکومت کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے، دشمنوں سے قبائلی و ذاتی عناد کا انتقام لینے کے لئے، لیکن منسوب کیا اسے مذہب سے اور مذہب ہی کا نام لے لیکر اس نے ہمیشہ لوگوں کی جانیں لیں۔ — تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہب کا اولین دور ہمیشہ اس نوع کے جذبات سے صاف و پاک رہا ہے، لیکن جب بعد کو اس میں ایک جماعت دنیا پرست لوگوں کی پیدا ہوئی تو جنگ و جدال کشت و خون سبھی کچھ ہوا، اور لوگوں نے غلطی سے اس کو مذہب کی تعلیم سے منسوب کیا پھر جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے لئے آج باہم نوع انسانی کے افراد میں مذہبی تفریق کو استخوان جنگ نہ بناؤ اور مذہب کو بدنام نہ کرو کیونکہ مذہب پیام امن و سکون ہے اور وہ فساد کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ اس لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دنیا میں وہ ہے جو قومیت اور وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور بڑا ظالم تھا وہ جس نے اول اول اس بدعت کو رواج دیا۔ آج ہندوستان اسی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہنوز غلام نظر آ رہا ہے درانحالیکہ اس سے بہت چھوٹے چھوٹے ملک کبھی کے آزاد ہو کر ترقی کی راہوں پر لگ گئے ہیں۔ غضب خدا کا کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے صدیاں گزر جائیں وہاں کی آب و ہوا کا اثر پڑتا پشت سے ہمارے ذوق و مزاج پر ہوتا چلا آ رہا ہو، ایک ہی قسم کی بہار و خزاں میں ایک زمانہ نامعلوم سے یکساں طور پر زندگی بسر ہو رہی ہو، لیکن پھر بھی بیگانگی کا یہ عالم کہ باہم ملکر کھانا بھی نہ کھا سکتے ہوں، محبت و رافت کے ساتھ ایک رات بھی کسی جگہ نہ بسر کر سکیں

مذہب کا شعار و مراسم کے لحاظ سے مختلف ہونا عیب نہیں لیکن ان کی وجہ سے باہم گرفت و احتراز، بغض و عناد پیدا ہونا یقیناً مذاہب کی توہین ہے، کیونکہ یہ کھلی ہوئی ہلاکت نوع انسانی کی ہے اور دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کا مقصد انسان یا انسانیت کو ہلاک کرنا ہو اسلئے ہموثر کرنا چاہئے کہ ہم مذہب کا کتنا غلط استعمال کر رہے ہیں اور انسانیت کی قربانی اپنے اغراض نفسانی کے دیوتا پر چڑھا کر، اسے مذہب کا خراج سمجھتے ہیں۔

اس وقت اندرون ملک کا سب سے بڑا ہنگامہ جو بہت زیادہ نازک صورت اختیار کرتا جاتا ہے، ہنگامہ کشمیر ہے، سب سے آخری مرتبہ جب یہ اضطراب وہاں نمودار ہوا، میں وہیں تھا اور وہ سب کچھ میرے ہی سامنے ہوا جو قوت و حکومت ہمیشہ ضعیف و بیدست و پافراد کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ لیکن میں نے مسلمانان کشمیر کی اس غیر معمولی جوش و خروش کی قدر کرنے کے باوجود کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ اس وقت اس نوع کے مظاہروں سے کام لیں۔ پھر ناپسندیدگی اس لئے نہیں تھی کہ میں ان کی خواہش آزادی کو پسند نہیں کرتا، بلکہ صرف اس بنا پر تھی کہ کوئی ان کا صحیح قاید و رہنما نہیں تھا اور وہ اپنے بڑھے ہوئے جوش کی وجہ سے بیدردانہ قتل ہو رہے تھے، علاوہ اس کے میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ملک کی موجودہ حالت اس کی مقتضی نہیں کہ اس قسم کا ہنگامہ پیدا کیا جاتا

اس میں شک نہیں کہ حکومت کشمیر بڑی حد تک مجبور ہو گئی ہے کہ وہ مسلمانان کشمیر کے مطالبات کو پورا کرے، لیکن معلوم نہیں مجھے کیوں یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ اس وقت اہل کشمیر کی یہ کامیابی کوئی ایسا رد عمل نہ اختیار کرے جو خود ان کے اور عام مسلمانوں کے لئے ناخوشگوار نتائج اپنے اندر رکھتا ہو۔

بہر حال اب معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس کے اثرات کو آسانی سے محو کر دیا جائے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آئندہ نہایت احتیاط سے قدم اٹھائیں اور کوشش کریں کہ یہ مسئلہ کہیں ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ نہ بن جائے کہ اس کا مستقبل نہایت خطرناک ہے۔

گول میز کانفرنس میں، ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر نیکیے لئے، جو گفتگوئیں ہو رہی ہیں، اُن سے نتیجہ نکالنا اب ہر شخص کیلئے آسان ہو اور شاید ہی کوئی دماغ ایسا ہو، جو اس کانفرنس کی کامیابی کی پیشین گوئی کر سکے۔

حکومت کا مقصود یہ ہے کہ کم سے کم جو کچھ دیا جاسکتا ہے، وہی دیا جائے اور ملک کی آزادی چاہنے والے کہتے ہیں کہ ہمیں وہ سب ملنا چاہئے جسکے بغیر ایک ملک کو آزاد نہیں کہہ سکتے۔

حکومت کہتی ہے کہ فی الحال صوبوں کی وسعت اختیارات پر قناعت کرنا چاہئے اور رابرٹن کا استدلال یہ ہے کہ جب تک مرکزی حکومت اختیار کامل نہ دیدیا جائے، اس لطف و عطا کے کوئی معنی نہیں۔

ہندوؤں کی جتنی جماعتیں ہیں، اُن سب کے نمائندے اس اصولی بحث میں متفق ہیں، لیکن وہ حضرات جو اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمائندہ کہتے ہیں، ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو برطانیہ کی حمایت درکار ہے اور اسی کے ظل عافیت میں ہمیں جینا ہرنا ہے۔

بعض کا اصرار ہے کہ ہم فیصلہ صرف دست حکومت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ مالک ہے، آقا ہے، جو اسکے جی بس آئے کرے جو چاہے مے اور جو چاہے ہم سے چھین لے۔ ہم بندگان مجبور کی فکر بیش و کم کیا فائدہ پہونچا سکتی ہے۔

بعض ہستیاں ایسی ہیں جو پہلے ہی سے اپنا حصہ اور بیش از بیش حصہ متعین کرنا چاہتی ہیں، کیونکہ وہ خائف ہیں کہ اگر انکے حقوق کا سوال ابھی سے طے نہ ہوا، تو پھر انکا پامال ہو جانا یقینی ہے۔ حالانکہ کوئی ان سے سوال کرے کہ آج یہ مسئلہ اگر انکی خواہش کے مطابق طے ہو جائے اور کل کو وہ زبردست جماعت جسکی قوت کو مسلمان نایندے صرف اس کی تعداد پر منحصر کرتے ہیں عہد سے منحرف ہو جائے تو کون شخص اسکی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ — بہر حال ان حضرات کے دلائل جیسے بھی ہوں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو مستقبل میں ہندوستان کی تاریخ لکھی جائیگی اور اس میں انقاد کا نفرنس کا اہم ترین واقعہ زیر قیاس ہوگا، تو مسلم نایندوں کی اس یاکیزہ ذہنیت، اس وطن پرستی، اور اس مذاکارانہ جذبہ ملی کو یقیناً مخصوص قلم اور مخصوص سیاہی سے نہایت نمایاں طور پر درج کیا جائیگا، تاکہ آئندہ نسلیں دیکھیں کہ اسلام کے بعض وہ افراد جنکی حقیقی عظمت کا اندازہ بہت کم لوگوں نے کیا تھا، کیسا زریں کار نامہ صفحات تاریخ پر چھوڑ گئے ہیں سچ ہے۔ — کیست کہ کوشش فرما دناں باز دہد مگر آں نقش کہ از پیشہ بخارا ماند

یاد رکھئے کہ اگر کانفرنس ناکام ثابت ہوئی جسکا یقین کیا جاتا ہے، تو ملک میں پھر ایک نئے جوش کیساتھ وہی تمام ذرائع اختیار کئے جائینگے جو اس سے قبل اختیار کئے گئے تھے اور وہ وقت سخت آزمائش و ابتلا کا وقت ہوگا۔ — اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر ملک و وطن کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یا کسی کو کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جانا چاہئے کہ انھوں نے کیا طریق کار پس کیا ہے اور وہ ذرائع سے مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں اگر واقعی کوئی مقصود متعین کیا گیا ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی تمام جماعتیں حقیقتاً اسی امر پر متفق ہو جائیں کہ حکومت کی موافقت اور کانگریس کی مخالفت کے علاوہ کوئی صورت مسلمانوں کے فلاح کی نہیں ہے تو کوئی جرح نہیں، یہی نصب العین سامنے رکھئے اور اسی پر اپنی تمام کوششیں صرف کر دیجئے، لیکن اسی کیساتھ یہ بھی سوچ لیجئے کہ اگر سید وقت حکومت کو کانگریس کے تمام مطالبات منظور کرنے پڑے، تو پھر آپ کیا کریں گے اہل حکومت تو حکومت کے دستبردار ہونیکے بعد بھی ایک نئی یافتہ جماعت کی طرح یہاں اپنا پورا اثر و اقتدار قائم رکھ سکیں گے، لیکن آپکے پاس کوئی چیز باقی رہ جائیگی جو آپکی حیاتی ضامن ہو سکے۔ دنیا میں صرف ایک ہی چیز ہے جو ایک قوم کو زندگی بخشی ہو اور وہ غیرت ملی ہے۔ پھر آپ کو اختیار خواہ اسکا استعمال آپ اب کیجئے جبکہ تھوڑا بہت وقت باقی ہے، یا اسوقت جب تیرا زمانہ جستہ کی طرح وہ آپکی دسرس بالکل باہر ہو۔

اس میں کلام نہیں کہ بہ حال موجودہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کشش و احترازی کے متعدد اسباب پیدا ہو گئے ہیں اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہندو جماعت اب کبھی داری کیلئے آمادہ نظر نہیں آتی، لیکن اگر غور و قائل ہو کام لیا جاتا تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ جفا کار سہی کچھ تو خطا اپنی بھی ہے، اس کے اسباب پر غور کیجئے، اور اگر وہ دور ہو سکتی ہیں تو انھیں دور کر کے دیکھئے، ممکن ہے یہ دشوار یا آسان ہو جائیں۔ یاد رکھئے دوسرے ایشیائے رواداری کی توقع جی بھی ہو سکتی ہے جب ہم بھی اسکے لائق رہیں، ورنہ یوں تو سوال صرف سر پھوڑنیکار ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی سنگستان کی تخصیص نہیں ہو سکتی، آپ کو اختیار ہے جہاں جی میں آئے اسواری لائے، زمانہ کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ وہ پلٹ کے اس منظر کو دیکھیں گا اور آپ پر دو آنسو بہا جی کی تکلیف گوارا کریگا۔

افسوس ہے کہ ماہ گزشتہ کے نگاریں معذرت نامہ بہو کاتب سے بطور ضمنیہ شائع کرنا پڑا اور دستری کی غلطی سے غالباً بعض پرچوں میں چسپاں نہ ہو سکا۔

ضمیمہ نگار

(آپ اس کی خانہ پڑی کر کے منجر نگار کو بزنس بھیج سکتے ہیں)

منجر صاحب نگار۔

- (۱) میں حسب ذیل خریدار نگار کو دیتا ہوں۔ جنوری سلسلہ ۲۰۰۰ء کی کتابت پر مطابقت غالب کے لئے وقف ہے معہ جدیدہ رنگی تصویر غالب کے ذریعہ دی پی بھیج کر سالانہ چندہ معہ محصول پانچ روپیہ چار آنہ وصول کر لیجئے۔
- (۲) حسب ذیل کتابیں بھی علاوہ محصول رعائتی قیمت پر جو ان کے نیچے درج ہیں ساتھ ہی ذریعہ دی پی بھیج دیجئے۔
- ظریف شاعروں کا تذکرہ (اصل قیمت ۱۰۰) جذبات بھاشا مصنفہ نیاز فتحپوری (اصل قیمت ۱۲)
- رعائتی قیمت ۸
رعائتی قیمت ۶

فراست التحریر ہر دو حصے (اصل قیمت ۸)

رعائتی قیمت ۸

جدید خریداروں کا نام و پتہ ذیل میں درج ہے۔

(الف)۔

(ب)۔

نوٹ۔ اگر رعائتی کتابیں نہیں لینا تو (۲) کو قلم و فرما دیجئے یا جو کتابیں لینا ہوں ان کو باقی رکھ کر باقی کو کٹا دیجئے۔

راقم۔

سہ یہ واضح رہے کہ دی پی وصول کرنے میں آپ کو پانچ روپیہ چھ آنے ڈاکخانہ کو ادا کرنا پڑیں گے اور اگر آپ نے منی آرڈر پانچ روپیہ بھیج دیا تو فیس منی آرڈر صرف دو آنے صرف ہوگی۔ گویا منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو ہر کا لفع ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے خواہ نگار کا چندہ اور کتابوں کی رعائتی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں یا دی پی طلب فرما کر اپنا نقصان برداشت کریں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اگر کتابوں کے لئے بھی رقم آپ بھیج رہے ہیں تو کم از کم ۵ روپیہ زیادہ محصول کے لئے روانہ کرنا ضروری ہیں۔

(نوٹ) کتابوں کی رعائتی قیمت سے ہر خریدار خواہ وہ جدید ہو یا قدیم، اس کا چندہ ختم ہوتا ہوا یا نہ ہوتا ہوا ٹاٹھا سکتا ہے۔ منجر

مسلمانوں کے قومی انتشار و فلاح کا اصل راز

اور

عزت و برتری کا غلط معیار

دنیا میں حقیقت کے خلاف جہاں بہت سی سینہ زوریاں ہیں، وہاں نسبی شرافت اور نسلی فخر و مباہات کا تخیل بھی ہے، ٹھنڈے دل سے غور کرنے والا ایک انسان جب علوم و معارف کی روشنی میں، نسل کے بننے بگڑنے اور عروج و زوال کا مطالعہ کرتا ہے، تو یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوتی ہے کہ انسان بعض اپنی دریدہ دہنی یا مغالطہ کی بنا پر حقیقت کے خلاف کیسی منہ زوریاں کر رہا ہے، دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ہو جو مراتب اور ماحول کے لحاظ سے شرافت و نجابت کا خلل دماغ نہ رکھتا ہو، ایک بڑے سے بڑا مصلح تمدن جب دردمند قوم بن کر ایسیج پر کھڑا ہوتا ہے تو قوم کے ہر فرد کے ساتھ وہ ایسا ہی رشتہ اخوت جوڑتا ہے، جیسے اسے خوئی و نسلی علاقہ ہو لیکن اللہ کے کایا پلٹ یہی اپنی خلوت کی صحبتوں میں اپنی برادری و قوم کے سوا دوسروں کو پیچ سمجھتا ہے، ایک واعظ ممبر برچرٹھ کر بنی اگر تم کی حدیثیں پڑھتا ہے، آپ کا درس اخوت سناتا ہے، خود روتا ہے، دوسروں کو رلاتا ہے، لیکن یہی صاحب جب پسند و وعظ لکھ کر گھر میں جاسے ہیں تو پھر مت پوچھئے وہی آپ ہیں اور آپ کی انانیت، الغرض کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اپنی شرافت و نجابت کے مقابلہ میں عام انسانوں کو جن کی نسلی شرافت دنیا میں تسلیم نہیں کی جاتی ہے، اپنے عمل یا اپنی گفتار سے اشارۃً یا کنایۃً فرو تر نہ بتایا ہو یا ان سے غیر مساویانہ سلوک نہ کیا ہو انسان ایسا کیوں کرتا ہے یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس پر آئندہ سطور میں روشنی ڈالی جاوے گی یہاں مجھے دکھانا صرف یہ ہے کہ تخیل نسب کے باب میں انسان کس قدر فریب خیال میں مبتلا ہے، ؟ جہاں تک یہ تخیل کس قوم میں زیادہ ہے وہیں تک وہ اجتماعی ترقی اور قومی منزلت سے دور ہے،

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نسب کا تخیل انسان کے اندر سیاسیات کے اثر سے پیدا ہوا ہے، اور محض سیاسی انقلابات نے انسان کو اصطلاحی شرافت کا مدعی یا نسلی پستیوں میں مبتلا کر دیا ہے، تاریخ اسلام ہی کو لے لیجئے اور مختلف

خاندانوں کے عروج و زوال کے واقعات پڑھ جائے، آپ کو معلوم ہو جاوے گا کہ دولت و جاہ کے ساتھ انسان کا نظریہ شرافت و نجابت بدلتا رہتا ہے، بہت سے مدعیان نجابت نے ایسے ایسے گھرانوں سے نسلی علاقہ قائم کر لیا جنکے پاس دولت و حکمرانی نہوتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، قطب شاہیہ خاندان کا بانی غلام تھا لیکن صفویہ (جنکا نسب شیخ صفی الدین اردبیلی کے سلسلہ سے حضرت موسیٰ کاظم تک منتهی ہوتا ہے) اور سادات طباطبائی (حسنی سید) نے ان سے ازدواجی تعلقات قائم کئے اسی طرح مغلیہ کا دور حکومت آیا تو صفویہ نے اپنے خاندان کی لڑکی مثل شاہزادہ سے بیاہ دی اسی طرح حصول حکومت یا حاکمانہ اثر جمانے کے لئے مختلف خاندانوں نے اپنا سلسلہ نسب قدیم شاہی خاندانوں سے قائم کر دیا کون نہیں جانتا سلطنت بہمنیہ کا بانی علاء الدین حسن ایک برہمن کا نوکر تھا لیکن شعرا کے تخیلات نے اس کا شجرہ نسب سلاطین فارس سے جوڑ دیا، اسی طرح عادل شاہیہ کا بانی یوسف عادل خاں بہر روایت بحر المتواج ایک چرکسی غلام تھا جسے محمد شاہ بہمنی نے خرید لیا تھا لیکن فرشتہ اور بساتین السلاطین کی روایات کے مطابق لوگوں نے اسے سلاطین روم (عثمانی خاندان) سے جا ملایا اور اس پر ایک نہایت پر لطف افسانہ بھی بیان کیا گیا، قطب شاہیہ کا زور ہوا تو اس کا سلسلہ نسب بھی ترکستان کے حکمرانوں سے جوڑا گیا اسی طرح نظام شاہیہ برید شاہیہ وغیرہ کے بانی غلام تھے، لیکن حکومت حاصل کرنے کے بعد مقامی اثر پیدا کرنے کے لئے انھیں برہمن وغیرہ کہا گیا فرشتہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی علمائے انساب کے دلائل کی بنا پر علویہ مصر کو اہل بیت سے نہیں تسلیم کرتا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے حضرات نے محض سیاسی اغراض کے لئے اپنا نسب نامہ بنالیا ہے، جسکی صراحت پو آئندہ صفحات میں ملے گی، اس لئے تاریخ شواہد کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اغراض کے حصول اور سیاسی اثر پیدا کرنے کے لئے نسب گڑھ لیا جاتا ہے، اسی طرح جاہ و منصب دولت و حکومت نسلی اختلاط کا موجب بن جاتی ہے، اور اس طرح ایک ذلیل قوم محض دولت و ثروت کی بنا پر شریف و نجیب بن بیٹھتی ہے، سیاسی تغیرات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شرافت و نجابت دراصل کوئی شے نہیں ہمارے حالات زندگی کے ساتھ یہ بھی انقلاب پذیر چیز ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا آج جو شریف و نجیب بنے بیٹھے ہیں وہ چند صدیاں قبل بارگاہ نجابت کے حاشیہ نشین تھے یا نہیں؟ اسی طرح آج جو حقیر و ذلیل خیال کیا جا رہا ہے، کل اپنے مساعی و اولوالعزمی، اپنی قوت ارادی و کمالات صوری و معنوی کی بنا پر شرافت نسبی کا مدعی نہ بن بیٹھے گا؟ یہ تو کلیہ ہے کہ تاریخ اپنے واقعات کا اعادہ کرتی ہے، جب آپ حقیقت کے خلاف اپنی اصلیت کو پیش کر رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کل آپ کی کمزوریوں اور اپنی جفاکشی سے فائدہ اٹھا کر دوسرا آپ کے مقابلہ میں اپنی برتری کا دعویٰ دار نہ ہو جائے،

ماہرین علم الانسان نے نسل انسانی کے اختلاط کے متعلق جو نظریات قائم کئے ہیں وہ اس قدر محکم اور معقول ہیں کہ کوئی صاحب ہوش ان سے انکار نہیں کر سکتا آپ کو آئندہ صفحات سے پتہ چلے گا کہ دنیا کی تمام زندہ قومیں مخلوط النسل ہیں اس لئے نہ منقولات کی روشنی میں کسی انسان کا دعویٰ نجابت قابل تسلیم ہے نہ منقولات کی روشنی میں،

انسانی نفسیات کی یہ ہنگامہ آرائیاں کچھ کم حیرت زا نہیں کہ ہم ایک ہی شے کو ایک خاص ماحول میں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسی شے کو جب دوسرے ماحول میں دیکھتے ہیں تو اس سے روحانی وابستگی کر لیتے ہیں ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ہماری یہ ذہنی انقلاب پذیری ہماری کمزوریوں کی بہت کچھ آئینہ دار ہے، کون نہیں جانتا حضرت خواجہ حسن بصریؒ حضرت ام المومنین بی بی ام سلمہؓ کی لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، حضرت ذوالنون مصریؒ کے والد ماجد قریش کے ایک نوبی (حبشی) غلام تھے، ولید بن عبد اللہ سقازنگی تھے، حضرت معروف کرخی کے والد علی بن موسیٰ رضاؑ کے غلام تھے اور دربانی کی خدمت پر مامور تھے، حضرت بایزید بسطامیؒ کے دادا گبر (آتش پرست) تھے پھر مسلمان ہو گئے، ابو محمد حداد ابو عبد اللہ ہمدی، ابو حفص حداد، ابو جعفر حداد وغیرہم لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، حضرت جنید بغدادیؒ کو ”قواریری“ کہتے ہیں اس لئے کہ آپ کے والد ماجد شیشہ بیچتے تھے، حضرت عبد الملک اسکاف چماری کا پیشہ کرتے تھے حضرت مالک دینار اپنے والد کی غلامی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، (دیکھو نفحات الانس جامی اور جواہر الاسرار مصنفہ حسین بن حسن سہروردی) نجابت و شرافت کے دعویدارو! ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان واقعات پر غور کرو، اگر پیشہ کی وجہ سے کوئی شخص ذلیل ہو سکتا ہے، تو اکابر صوفیہ جھنوں نے تصوف اسلامیہ کی بنیاد قائم کی اسی ذلیل پیشہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اگر تم انکے سامنے نیایش و عجز کرنے پر مجبور ہو تو کوئی وجہ نہیں آج ایک مسلمان کو صرف اس وجہ سے ذلیل سمجھو کہ وہ ایسا پیشہ کرتا ہے جسے تم ذلیل سمجھتے ہو زیادہ سے زیادہ پیشہ کو فروتر کہہ سکتے ہیں انسان کی شرافت کو اس سے کیا تعلق؟ لطف تو یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں پیشہ سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی انسان کے جسم میں اس پیشہ کی ذلت خون کی طرح جاری و ساری رہتی ہے، نسلِ عصبیت نے سیاسیات اسلامیہ کو کس قدر نقصان پہونچایا ایک دلدار تاریخی حقیقت ہے، بنی حمیر اور آل کی قدیم قبائلی نزاع نے عرب سے باہر ممالک عجم میں تاریخ کے جو عبرت ناک صفحات چھوڑے ہیں وہ ہمیں سبق دینے لئے کافی ہیں ہسپانیہ کے اندر عرب نسل کے لوگوں نے مولدین اور مقامی باشندوں کے ساتھ جیسا حقارت آمیز سلوک کیا اس کی داستان اس قدر غمناک اور اس کا نتیجہ اس قدر درد انگیز ہے، کہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے آج بھی دل مسوس لیتے ہیں مشہور مورخ امیر علی (مرحوم) نے اپنی تاریخ عرب کے اندر ان واقعات پر نہایت عاقلانہ طور پر رائے زنی کی ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے،

عرب میں بہتیری دفعہ مختلف قومیں آباد ہوئیں، لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم باشندے اسی نسل سے تھے جس نسل سے قدیم کلدانی ہیں انھوں نے بہت بڑی تمدنی ترقی کر لی تھی جس کے آثار ہنوز جنوبی عرب میں پائے جاتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی حکومت مصر اور دیار بحر تک پھیلی ہوئی تھی انھوں نے بڑی بڑی عمارتیں اور معابد بنائے اور مشہور تالاب جو ہنوز عدن کے نزدیک پائے جاتے ہیں ان کے تعمیری کارناموں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

اس قدیم قوم کو ایک سامی الاصل قبیلہ نے تباہ کر ڈالا، جو دریائے فرات کے مشرقی جہت کے بعض مقام سے رونما

انھیں باہم مخلوط بنا دیتی ہے

آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عربوں کا یہ معاملہ نہ تھا، پیغمبر کی لغت کے بہت قبل حمیری زبان جو سامی اور مقامی زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھی خالص عربی زبان بن چکی تھی، بنی مضر ہی زبان بولتے تھے، جس نے ایک علمی فوقیت حاصل کر لی تھی اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام باشندے مکالمہ کے خفیہ اختلافات کے ساتھ ایک ہی زبان بولتے تھے، انکار رسم و رواج، ان کے خیالات و جذبات یکساں تھے اور پھر بھی دونوں قوموں کے درمیان ایک شدید اور بے نقسم تھی ہم لوگوں کو اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے گہری جستجو کرنی چاہیے، لغت اسلام سے کئی صدیاں قبل حمیریوں نے ایک عظیم الشان تمدنی ترقی کر لی تھی وہ جہاں کہیں بھی آباد تھے ایک منظم حکومت رکھتے تھے، اس میں شک نہیں یہ قدیم طرز کی ہوتی تھی، پھر بھی ان کی شہری زندگی کے معمولی مقاصد کے لئے کافی طور پر پابنا بٹلہ تھی، وہ فن تحریر سے واقف تھے، اور خصوصیت کے ساتھ زراعت کا پیشہ کرتے تھے، بنی مضر (بہ استثنائے قریش جو قصی کے زمانہ سے ایک حد تک تمدن ہو گئے تھے) خانہ بدوش اور صحرا نورد تھے، ہر قبیلہ مفاد اور بہرہ ریزی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھا اور اپنا اپنا سردار ایک قسم کی رائے عامہ سے منتخب کرتا تھا اس قسمی حالت نے انھیں ملوک حمیری کی اطاعت کے لئے مجبور کر دیا اور وہ (بنی مضر) پیہم جنگ و جدل کے باوجود پانچویں صدی عیسوی تک انھیں خراج دیتے رہے، بنی حمیر اور بنی مضر کی پیہم لڑائیوں نے جنکا مقصد ایک طرف جبروت و اقتدار حاصل کرنا اور دوسری طرف خود مختاری حاصل کرنا تھا بغض و عداوت کا ایک سخت احساس پیدا کر دیا تھا اور دونوں میں مخالفت کی ایک آگ مشتعل تھی جسے ہر دو طرف کے منہنی اور شعرا ان ایام کی یاد دلا کر جبکہ کندہ نے بنی تمیم کا تعاقب کیا اور بنی قیس بنی ازدر لوث پڑے، بریار کھتے تھے۔ محمد کی تبلیغ نے نسلی عداوت کو مٹانا اور مغنیوں کا اثر زایل کرنا شروع کیا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو آپ کی تعلیم اور آپ کی عجیب و غریب شخصیت ان کو ایک قومی رشتہ میں منسلک کر دیتی دس سال کی رسالت کا زمانہ گورچون تھا لیکن قومی عصبیت کے زہر کو جو صدیوں عربوں کے خون میں سرایت کر چکا تھا، بجھانے کے لئے بہت کم زمانہ تھا مدینہ میں جہاں آپ کا اثر مستقل اور مسلسل تھا یہ اختلاط مکمل پایا جاتا ہے،

حضرت ابو بکر اور عمرؓ کے زمانہ میں موج فتوحات قبایل عرب کو دنیا کے مختلف حصوں میں لے گئی، بنی مضر بصرہ میں آباد ہوئے، بنی حمیر خصوصیت کے ساتھ کوفہ میں بسے، فلسطین اور صوبہ دمشق میں بنی مضر صاحب اقتدار تھے۔ شام کے شمالی حصہ پر شمالی عرب کی طرح بنی حمیر قابض ہوئے، مشرقی صوبوں میں بھی کم و بیش مصر و افریقہ کی طرح برابریاں کئے، لیکن جہاں کہیں وہ گئے، اپنی قدیم مخالفت ساتھ لیتے گئے، عمر اعظمؓ کے زمانہ میں یہ جبریہ مخالفت دبی رہی اگر حضرت علیؓ امن کے ساتھ حضرت عمرؓ کے جانشین ہو جاتے تو غالباً دونوں قبیلے ایک قومی صورت اختیار کر لیتے لیکن حضرت عثمانؓ کی حکومت میں بنی امیہ نے اپنی غرض کے لئے ختم ہو جانے والی دشمنی کی اس آگ میں جو خاکستر کے اندر دبی ہوئی تھی، پھر

اشتعال دے دیا یہاں تک کہ اس نے ایک شعلہ ملتہب کی صورت اختیار کر لی جو اسی خوفناک طریقہ سے ہسپانیہ اور صقلیہ میں دمک رہا تھا جس طرح افریقہ کے ریگستانوں، خراسان کی وادیوں اور کابل کے دشت زاروں میں ملتہب تھا۔ اس افسوس ناک دشمنی نے عرب قوم اور جرمن درومی قوموں کی قسمت پر جبکہ ساتھ عرب مبارزت میں الجھے ہوئے تھے گہرا اثر کیا اس نے ان کے فتوحات کی راہ اس وقت مسدود کر دی جبکہ مغرب ان کے قدموں پر تھا اور ان کے ممالک محروسہ کا ایک حصہ ضائع کر دیا مسلمانوں کی ہسپانوی سیاسیات کے متعلق مورخ موصوف مفصلہ ذیل تبصرہ کرتے ہیں

خلیفہ ہشام نے سلسلہ عرب میں انتقال کیا اس کا لڑکا حکیم لقب بہ المختصر اس کا جانشین ہوا، ابن اثیر اس کے متعلق لکھتے ہیں، کہ وہ عاقل شجاع اور بالکمال بادشاہ گزرا ہے، اور ملوک اندلس میں وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے چاروں طرف شان و شوکت کے منافذ جمع کرنے لیکن اس کی حکومت میں اندرونی مشکلات کے باعث برابر بے امنی رہی۔ فقہا جیسا چاہتے کرتے، وہ مزاج کے اعتبار سے ایک راہب کی زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اس کی طبیعت نشاط پسند تھی وہ شکار کا شائق تھا، اور فقہاء و علمائے دین کی صحبت سے سکون پذیر نہ تھا اس نے اپنے یہاں شعرا، مغنی اور علما کی جماعت پیدا کر لی تھی، ان سب باتوں سے فقہا اس سے ناخوش ہو گئے ہشام کی فیاضانہ کو غلط حکمت عملی سے ملک میں فقہا کا اقتدار قائم ہو گیا تھا حکم بھی گوان کے ساتھ توجہ کے ساتھ سلوک کرتا تھا اور عدالت کے فیصلوں کے مطابق عمل کرتا تھا لیکن اس نے ان کو معاملات حکومت سے بالکل جدا کر دیا تھا انھوں نے دیکھا کہ ان کی امید اقتدار پر باقی پھر گیا وہ دینی عالم ہونے کے فخر میں چور تھے، انھوں نے ممبر برائے ملحد اور لامذہب کہا اور اس کی روح کی نجات کے لئے دعا کی اس صورت سے انھوں نے مسلم اہل ہسپانیہ کی مذہبی عصبيت کو ابھارا جن پر ان کا لامحدود اثر تھا تمام جزیرہ نمایں آبادی کا بڑا حصہ نو مسلموں پر مشتمل تھا خاص خاص شہروں مثلاً قرطبہ اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ وغیرہ میں نو مسلم اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے عربوں، بربریوں اور مسلم اہل ہسپانیہ میں بالخصوص شمالی صوبوں میں شادی بیاہ کا رواج تھا ایسی شادی بیاہ سے جو اولاد ہوتی تھی اسے "مولد" کہتے تھے خالص نسل کے عرب، "بلادیوں" (ہسپانیہ کے اصلی باشندے) اور "مولد" کو حقارت سے دیکھتے تھے ان کے ساتھ متکبرانہ سلوک کرتے اور عہد ماموی میں فارس کی طرح انھیں حکومت کے اعلیٰ مناصب سے محروم رکھتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے جواب میں دونوں ان سے نفرت کرتے نو مسلم اہل ہسپانیہ نے پیالہ عربی حکومت کے خلاف غضبناک بغاوتیں کیں فقہا اس سخت نسلی اختلافات کو دبائے کی بجائے دیسی باشندوں کے ساتھ شریک ہو گئے اور ان کو بادشاہ کے خلاف بغاوت انگیز رویہ اختیار کرنے میں ترغیب دی

مسلمانو! عبرت حاصل رو، ایک وہ زمانہ تھا جبکہ بنی اکرم غیروں سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے آپ نے بنی حمیر اور بنی مضر کی قدیم نزاع مٹا دی، کیا تاریخ کا یہ معمولی واقعہ ہے، کہ انصار (آل حمیر) اور مہاجرین (بنی مضر) میں مدینہ کے اندر موخوۃ کا رشتہ قائم ہو گیا اسلام نے صرف یہی نہیں کہ قریش کی نسلی عصبيت کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا بلکہ

ان کے خون کے ساتھ عجی بربری، لوبی شامی خون ملا دیا اور اس طور سے ان کے پندار کا دروازہ ہی بند کر دیا عہد نبوت پر ایک سرسری نظر کیجئے، آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ مسلمان جو اسلامی عقائد کے مطابق تمام مسلمانوں سے زیادہ محترم ہیں تعداد میں بہت کم تھے، مہاجرین اور انصار کا اختلاط نسلی تاریخ اسلام کی کھلی ہوئی حقیقت ہے، اگر آپ اپنی قریشیت، ہاشمیت میں کسی حیثیت سے دوسرا خون شامل ہونا تسلیم نہیں کرتے تو خدا را خود کو ان افضل المسلمین سے نہ جوڑیئے جنھوں نے توسیع مذہب کے لئے وطن چھوڑا، بال بچے چھوڑے، بیویوں کو طلاق دی وہ تو مجبور تھے کہ جدید تحریک کا ساتھ دینے کے لئے دوسرے خاندان اور اجنبی نسل کے لوگوں کو اپنے اندر جذب کریں اگر آپ اپنی اصلیت اور شرافت نبی کے ایسے ہی مدعی ہیں تو ان مسلم آزار قریشیوں سے رشتہ جوڑئے جو فتح مکہ تک اسلام نہ لائے، اس کے بعد بھی فارس و شام ہنر و بربر، ہسپانیہ و روم، ہندو چین میں عربوں نے ہجرت کی اور وہاں مقامی باشندوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کئے اس لئے کوئی مسلم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ماں اور باپ دونوں طرف سے وہ عہد اسلام سے آج تک قریشی یا ہاشمی ہے، موجودہ ہاشمیوں اور قریشیوں میں (میری مراد ان سے ہے جو عہد جدید میں خواہ مخواہ نہیں بن بیٹھے) بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کا آبائی سلسلہ فارس اور بربر، حبش و شام کے مسلم غلاموں تک منتهی ہو گا مادری سلسلہ نسب کی حفاظت تو مسلمانوں کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اور اگر ان کا دعویٰ صحیح بھی ہو تو بھی جن حضرات کا سلسلہ نسب پدری جانب سے ہاشمی یا قریشی تک مستند و معتبر ہے خواہ ان کا مادری نسب کسی قوم سے کیوں نہ ملتا ہو کسی طرح نجابت و شرافت کے دعویداروں سے فروتر نہیں ہو سکتے کیا آپ اہل بیت اطہار کے مادری سلسلہ نسب سے واقف نہیں؟ آپ کو آئندہ سطور سے پتہ چلے گا کہ کس طرح لوبی رومی، بربری ایرانی لونڈیاں خاندان رسالت میں جذب ہوئیں اور کس قدر کثیر اولاد انھیں لونڈیوں کے بطن سے پیدا ہوئی، اسلامی دنیا کا کون انسان ہے جو حضرت موسیٰ کاظم، امام رضا، علی نقی، محمد تقی، حسن عسکری، محمد مہدی کی نجابت کو تسلیم نہیں کرے گا لیکن یہ تمام حضرات لونڈیوں ہی کے بطن سے تھے، حضرت علی، حضرت حسن اور امام زین العابدین کی کثیر اولاد جو لونڈیوں کے بطن سے پیدا ہوئی سادات نجیب کے نام سے دنیا میں پھیلی پس ہمارے ہندوستان کے ”منہ زور“ شیوخ و سادات خواہ مخواہ پندار کو راہ دیکر کیوں اپنی برادری کے ان افراد کو ”خارج“ (OSTRACISED) کر دیتے ہیں جو غیر قریشی ماؤں کے بطن سے ہوں، ابھی وقت ہے کہ شیوخ و سادات اس ”افسانہ کرد“ کو منکر توجہ کریں اور اپنی روایاتی عظمتوں کی لالچ رکھیں ورنہ وہ دن زیادہ دور نہیں جبکہ ہندوستان کے قرشی الاصل مسلمان جنکو شیوخ و سادات محض اس بنا پر اپنی برادری میں شامل نہیں کرتے کہ وہ غیر قبیلہ کی ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اپنا ایک نظام الگ قائم کر لیں کیونکہ ہندوستان کے بعض خاص مقامات میں ایسے افراد کو جو معاشرانہ وقتیں لاحق ہوتی ہیں ان کی داستان اس قدر دلخراش ہے کہ بیروان اسلام کی طرف منسوب کرنے کو جی نہیں چاہتا، ابھی میں ان عملی تجاویز کو پیش کرنا نہیں چاہتا، جنکے ماتحت

قریشیوں کا نظام درست ہو سکتا ہے، اور یہ کہ غیر قریشی مسلمانوں کے ساتھ ان کے کیا مخصوص تعلقات ہونا چاہئیں، جنھیں عام طور پر شیوخ و سادات نے نظر انداز کر دیا ہے، اس وقت مقالہ ہذا پیش کر کے میں ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں یہ خیالات صرف شیوخ و سادات ہی کے لئے مفید نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے مفید ہیں خواہ ہیئت اجتماعیہ میں وہ ممتاز حیثیت رکھتے ہوں یا فرد سمجھے جاتے ہوں کیونکہ تمام قبائل (ذات) کے یہاں نسب میں دُری سلسلہ کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے، اور ہر قبیلہ کا ایک ایسا فرد جو غیر قبیلہ کی عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہو اسی طرح "خانماں برباد" ہوتا ہے جس طرح آل قریش و آل ہاشم۔

سبب تالیف جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مقالہ ہذا اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو زبان میں بالکل جدید چیز ہے لیکن نا انصافی اور ناقدر شناسی ہوگی اگر میں اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی نہ کر لوں کہ اس موضوع پر جناب ہوش بلگرامی کا ایک مختصر مضمون "واسطی النسل مسلمان" کے عنوان سے غالباً دسمبر ۱۹۳۰ء یا ابتدائے ۱۹۳۱ء میں "نگار" کے اندر شائع ہوا تھا ہر چند اس کے اندر مقامی رنگ تھا اور مقالہ ہذا کی ترتیب و مباحث کو اس سے علاقہ نہیں لیکن جناب لوی سیدناظر الحسن ہوش بلگرامی کی اخلاقی جرأت قابلِ صد عظمت ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر پہلے پہل ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر آج تک کسی نے اظہار خیال نہیں کیا اور یہ میرے خیال میں ارباب علم کی اخلاقی جرأت کے فقدان اور رسمیات کے ساتھ لغو و مہمل سازگاری کا نتیجہ ہے میں نے جناب ہوش کا وہ مضمون اس وقت پڑھا تھا جب مجھے اخباری دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا کیونکہ ستمبر ۱۹۳۰ء سے میری اس زندگی کی ابتدا ہوئی پھر بھی آج تک مجھے آپ کا وہ نوٹ یاد ہے جس کے تحت آپ نے بعض ارباب وطن کی سفیہانہ نکتہ چینیوں اور حاسدانہ رویہ کا گلہ کیا تھا جناب ہوش ملک کے مشہور ادیب ہیں ایک بلند پایہ شاعر شمار کئے جاتے ہیں، لوگ آپ کے وطنی تعلقات سے بھی واقف ہیں (جہاں فطرت کی فیاضیاں صرف ادیب و شاعر، عالم و فاضل ہی پیدا کرتی ہیں) اور حیدر آباد میں آپ کے اعلیٰ فوجی منصب سے بھی لیکن میرے دل میں جناب ہوش کی جو حقیقی عظمت ہے وہ نہ تو آپ کی ادبیت و شاعرانہ بصیرت کے باعث ہے نہ واسطی الاصل اور امیر العسکر ہونے کی وجہ سے، آپ کے مسطورہ بالا مقالہ نے میرے دل پر آپ کی اخلاقی جرأت کا ایک ایسا نقش جمیل بٹھا دیا ہے، جس کی دردمند تفسیر حزیں لاہجی کے اس شعر سے بہتر نہیں ہو سکتی ہے

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو فریاد از تطاول مشکیں کند تو

حزین کی طرح میں بھی جناب ہوش کے "تطاول ادبی" کا فریاد ہوں کیونکہ صوبہ بہار کا ایک دور افتادہ طالب العلم و کن کے اس ادیب رعنا کے مقابلہ میں "صید حرم" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، ناظرین یہ جانکر سخت تعجب کریں گے کہ میں جناب ہوش کو بس اسی قدر جانتا ہوں جس کا اظہار میں نے سطور بالا میں کیا ہے در نہ مدوح کو تو یہ بھی خبر

نہیں کہ کوئی "دل شوریدہ" بقول غالب "ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے"

بہر حال مقالہ ہذا اردو صحافت میں "ثانوی" حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یقیناً اس میدان کے اولین مہر و جناب ہوش ہیں مقالہ ہذا جن جذبات کے تحت لکھا گیا ہے وہ مجھے سالہا سال تک بے چین کر چکے ہیں یہ جذبہ مجھ میں اس وقت پیدا ہوا جب میں نے غالباً آٹھ یا نو سال کی عمر میں اپنے والد مرحوم سے ایک سوال کیا تھا مرحوم کو کیا خبر تھی کہ جس سوال کا جواب وہ اس آسانی اور غیر اہمیت کے ساتھ دے رہے ہیں وہ آگے چل کر میرے دماغ کا بے چین کرنے والا مرکزی خیال ہو جاوے گا جس کے ڈانڈے جنون سے ملتے ہیں مسلسل بیس ایکس سال تک اس جذبہ کی پرورش کرنے کے بعد آج میں اس کا اظہار کرنے بیٹھا ہوں اس عرصہ میں روح کے اندر جیسی درد مندی و فتادگی خیال کے اندر جیسی حیات فرسا سلسلہ جنبانیاں ہوتی رہیں انھوں نے میری نفسیات پر گہرا اثر کیا ایک مدت تک دل کی حالت ایسی تھی کہ "نکتہ تحقیق حسن البیضا" میری آنکھوں کے سامنے ایسے مناظر تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر میرا دل دکھتا تھا، قلب بے چین تھا آنکھیں نم تھیں گویا دنیا تعبیر تھی آشکدہ سے اور اس کی جلن سوز جہیم سے کم نہ تھی فار الدنالموقدۃ الہی تطلع علی الکافر (وہ اللہ کی آگ ہے۔ سلگائی ہوئی، جو دلوں تک جا پہنچے گی)

دل کے پچھلے جل اٹھے سینہ کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اگر ایک طرف جناب سیدناظر الحسن کی جرات اخلاقی نے مجھے بھی اس میدان میں حوصلہ خامہ فرسائی بخشا تو دوسری طرف جناب خواجہ نذیر حسن مرحوم کی زندگی نے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں آپ کی زندگی کے مدوجز و کامطالعہ کرنے کے بعد دنیا کے سامنے اپنی "حدیث درد" پیش کروں نذیر حسن کا نام آتے ہی میں خیال کی ایک ایسی بسیدہ فضا میں جذب ہو جاتا ہوں جہاں ہستی تعبیر ہے ایک گہرے سوز و دروں سے جہاں پہنچ کر ہماری حسیات زندگی کا مقصد محض درد و الم بتاتی ہیں اہل دنیا کا قلعہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کی جدائی پر سوز فرماتی کہتے ہیں مرنے والے کے نقوش و فوارہ دلاؤ میرا پیرایہ میں روشنی ڈالتے ہیں اور اس طور سے خود روئے ہیں دوسروں کو لڑاتے ہیں دنیا کے اندر فطرت کی فیض بخشیوں میں سے اولاد بھی ہے جو اس فرض کو انجام دیتی ہے لیکن آہ! نذیر اس سے بھی محروم رہے ان کی زندگی کے وہ واقعات جن کا تعلق "نہا نخانہ خلوت" سے ہے اور جن کی حقیقت سے اولاد بیوی اور قریبی رشتہ داروں کے سوا کوئی دوسرا باخبر ہو ہی نہیں سکتا معمولی سطح کی چیزیں نہیں ہیئت اجتماعی کا نظریہ تقدس و محبت ہی جداگانہ ہے وہ عبا ئے را اور دستار و جبہ کی پرستش کرتی ہے، وہ جان دیتی ہے تو ظاہر فریب تقدس پر اس کی نگاہوں میں عزت ہوتی ہے ارباب جاہ و ثروت کی وہ اپنے جذبات لطیف کا اظہار کرتی ہے تو ان کے ساتھ جن کے افراد قبیلہ کثیر تعداد میں ہیں، خواہ کسی کے فضل و کمال کے اندر اخلاقی تہی یا لگی ہو، خواہ ارباب جاہ کے اندر خبیث قسم کا پندار ہو، خواہ

کسی کو رفتار کی کثرت نے حد درجہ رعنا بنا دیا ہو لیکن ہے یہ عجیب بات کہ ہیئت اجتماعی کا تعلق محبت و احترام و وابستہ ہوتا ہے تو انھیں افراد کے ساتھ یا کم از کم ہیئت اجتماعی موقعہ اور ”نظر التفات“ کی تاک میں رہتی ہے، اور جب کبھی یہ موقع ہاتھ آجاتا ہے تو وہ ان عجیبہ خیالات کا اظہار کر دیتی ہے، جسے نفسیات کی روشنی میں ایک برتر فاسف ہستی کے مقابلہ میں ایک فرد ہستی کی در ماندگی (سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہیں انسان اپنی

پیدائشی شرافت کھو بیٹھتا ہے، اور یہیں سے کفر و اسلام، شرک و توحید کی منزل شروع ہوتی ہے، میرے خیال میں مذاہب عالم اسی تفریق کو مٹانے کے لیے آئے اور شرک کی ابتدا اسی ”السانیت پرستی“ سے ہوئی اسلام کا پہلا درس انسانی مساوات اور عالمگیر اخوت ہے، جس نے اس درس کو نہ سمجھا اس نے گویا اسلام کے مفہوم ہی کو نہ جانا، کسی انسانی ہستی کے سامنے خود کو فرد تر سمجھنا شرک کی پہلی خطرناک منزل ہے، ”آر باب منتصر حقن خیرام اللہ الواحد الفہار“ اسی طرح کسی انسان سے اپنی ذات کو بالاتر سمجھنا ”توحید“ کی بجٹکنی ہے، اس تمہید کے بعد کہنا یہ ہے کہ خواجہ نذیر حسن علوم رسمہ سے بہرہ ور نہ تھے دولت مفقود تھی عزیز و اقارب کی بڑی تعداد مٹ چکی تھی جو باقی تھے انھیں سوسائٹی ایک خاص منزلت کی نگاہ سے دیکھتی تھی، دولت ان کے پاس، رفقا ان کے ساتھ علوم و معارف سے وہ بہرہ اس لئے نذیر حسن کے ساتھ ان کی کم نکا ہیاں کسی غیر معمولی نفسیات کا نتیجہ نہ تھیں نذیر نے دنیا میں قدم رکھا تو سب کچھ تھا عہد طفولیت ایک ایسے شفیق باپ کے آغوش محبت میں گزر ا جو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے آپ کے والدیدار خواجہ وزیر علی آرہ کے ان روسائے عظام میں تھے جن کو خدائے خاندانی سیادت کے ساتھ دولت کی فراوانی بھی عطا کی تھی سید خواجہ وزیر علی کا خاندان آرہ میں غالباً آج سے دو صدی قبل محلہ مہادیو میں آباد ہو گیا تھا خواجہ وزیر علی ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی سید تھے، آپ کے دادا جناب سید خواجہ محمد مہدی کی بنائی ہوئی مسجد آج بھی آرہ میں ”خواجہ کی مسجد“ کے نام سے موجود ہے، ۱۷

لے یہاں پر میں خواجہ نذیر حسن کے بعض ان تعلقات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جنکی خبر مجھے کبھی نذیر حسن مرحوم نے تو ندی کیونکہ ”غم روزگار“ میں وہ ایسے پھنسے رہتے تھے کہ اس نوع کی گفتگو کم کرتے البتہ آپکی والدہ محترمہ جو آج تک زندہ ہیں کبھی بھی اس عہد ماضی کا افسانہ سناتی ہیں، صوبہ بہار کے مشہور رہنما مسٹر مظہر الحق صاحب (بیرسٹر) نے جنکا انتقال ہو گیا اپنے ایک طویل مراسلہ کے ذریعہ مجھے ان واقعات سے مطلع کیا مسٹر مظہر الحق مرحوم کے والد جناب احمد اللہ صاحب فاروقی (سیوان) اور نذیر حسن مرحوم کے والد سید خواجہ وزیر علی حقیقی ممیرے بھوپھرے بھائی تھے، نذیر حسن مرحوم کے آبائی سلسلہ میں مجھے صرف چار بزرگوں کے حالات معلوم ہو سکے

خواجہ نذیر حسن بن خواجہ وزیر علی بن خواجہ نثار علی بن خواجہ محمد مہدی بن سید خواجہ مقبول جناب مظہر الحق مرحوم کے بیٹے ہیں

خواجہ نذیر حسن کے رشتہ دار بہپورہ پٹنہ، سیوان وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن آ رہے ہیں وہ جس افتادگی و بیچارگی کی زندگی بسر کرتے تھے اس کا احساس کچھ انھیں حضرات کو ہو سکتا ہے، جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے مروج نے وہ بھی زمانہ دیکھا تھا جب آپ کے والد کے قبضہ میں، بیریا، رسول پور، ہردی چھپرہ، کوٹلیپور وغیرہ کی وسیع جائدادیں تھیں، گھر میں خدمتگار تھے، لونڈیاں تھیں، مائیں تھیں، عیش و عشرت کا سامان تھا گویا وہ تمام حوصلہ افزا سامان تھے جن کا وجود انسان کو مستقبل سے بے نیاز کر دیتا ہے، نذیر حسن عہد شباب کی تمام بے راہرویوں، دولت و جائداد کی بربادی اور رفقا و عزیزوں کے مٹنے کے باوجود اگر صرف تعلیم ہی حاصل کر لیتے تو زندگی کی ان صعوبتوں میں کچھ ضرور تخفیف ہو جاتی جنکی یاد آج بھی کم از کم میرے دل میں اس قدر ہجوم تاثرات پیدا کر دیتی ہے کہ بے اختیارانہ اشک کے

بقیہ نوٹ صنف - خطوط (بہ زبان انگریزی) میرے پاس محفوظ ہیں انکا پہلا خط ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مجھے موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے مفصلہ ذیل باتیں لکھی تھیں۔

آشیانہ ڈاکخانہ آندر

ضلع سارن

عزیزم مسٹر عبدالملک

میں تمھارا خط مرقومہ ۳ جولائی پاکر بہت محفوظ ہوا تمھیں کسی پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ خواجہ وزیر علی جو میرے چچا اور قریبی رشتہ دار تھے، موصوف ہمارے والد اور والدہ کے حقیقی باموں زاد بھائی تھے، اور میں نے اکثر اپنے والدین کو ان کا تذکرہ کرتے سنا ہے، مجھے بھی ان کی یاد اچھی طرح باقی ہے، چونکہ طفولیت میں انھیں میں نے دیکھا تھا اسلئے دیکھو بہت ہی قریبی رشتہ سے میرے بھانجہ میں فرط مسرت کے ساتھ خاندان کے متعلق مفصلہ ذیل حالات لکھتا ہوں

خواجہ محمد مہدی کو صرف ایک لڑکے نثار علی نامی تھے، خواجہ نثار علی کو ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوئیں، لڑکیوں میں ایک کی شادی حکیم کاظم حسین صاحب عظیم آبادی اور دوسری لڑکی کی شادی خواجہ امداد سے ہوئی، خواجہ مہدی صاحب کی چار لڑکیاں اور تھیں جن میں سب سے بڑی میری جدہ مادری تھیں جنکی شادی حکیم حامد علی صاحب سے ہوئی تھی، انھیں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں میں سب سے بڑی لڑکی کا فرزند ہوں، خواجہ محمد مہدی کی دوسری صاحبزادی کا عقد میر دام علی ساکن جسنپورہ ضلع سارن سے ہوا تھا تیسری صاحبزادی کا عقد مولانا ابوالحسن سے ہوا تھا جو ہندوستان کے بڑے (مشہور) منطقی گزربے ہیں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جنکی شادی سید محمد اسماعیل سے ہوئی جنکے صاحبزادہ پٹنہ کے وکیل نور الحسن صاحب ہیں خواجہ محمد مہدی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہماری جدہ کمرہ تھیں، میری ایک ہمشیرہ ہیں جنکی چھوٹی صاحبزادی کا عقد اکثر سید محمود سے ہوا، اگر کسی نامہ کے اندر اور بھی اسماء ہیں جو اس وقت موجود نہیں ضرورت ہوگی تو روانہ کرونگا، میں امید کرتا ہوں کہ تم آئندہ براہ خط لکھا کرو گے اور اگر ممکن ہو تو ملاقات کر دے گی میری مکان پر سیوان ریلوے اسٹیشن سے بہت اچھی طرح آ سکتے ہو۔ تمھارا چاہنے والا

منظر الحق

چند قطرے ٹپک پڑتے ہیں یہاں پہنچ کر انسان قسمت کے نہٹنے والے واقعات کا معتقد ہو جاتا ہے، خواجہ وزیر علی مرحوم نے نذیر کو تعلیم دلانے کا سامان کیا، ڈیوڑھی پر مٹیاں جی رکھے گئے، لیکن کہیں اکلوتا بیٹا لاڈ سیار میں 'ہو استاد' کا متحمل ہوتا ہے، نتیجہ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے، نذیر جاہل رہ گئے، جائیدادیں برباد ہو گئیں، والد کا انتقال ہوا، عہد شباب معصیت کو شیوں میں بسر ہوا، آنکھیں کھلیں تو منزل سے دور جا چکے تھے بہنوں کی پرورش، ان کی شادی، بیاہ، بھائی کی تعلیم والدہ کی خدمت الغرض سارے گھر کا بار ان کے سر پر گر گیا۔ علم و فن سے بے بہرہ تھے کرتے کیا سڑک پر بیٹھ کر روٹی (پنہ) انیچی، غلہ کی تجارت کی، تیل بیجا الغرض وہ سب کچھ کیا جو شکم کی مجبوریاں انساں سے کراتی ہیں، میں نے ان کی والدہ محترمہ سے یہ بھی سنا تھا کہ جب وہ گھوڑے پر نکلتے تو خدمتگار لگام پکڑے ساتھ رہتے اور ایک زمانہ میں یہ پڑ افسوس نظر آ رہا بھی دیکھا کہ سڑک پر بیٹھے روٹی بیچ رہے ہیں، یہ ہیں زمانہ کی نیرنگیاں، اور یہ ہے قسمت کا لکھا ہوا جسے ہم اعمال بد کی داستان عبرت سے تعبیر کرتے ہیں، بہر حال نذیر حسن کے آبائی رشتہ داروں کے چھوٹے کی ایک وجہ تو ان کی عسرت و ناداری، جمل و فتدان تربیت ہے، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہی ایک وجہ نہیں مرحوم کی پڑ افسوس زندگی کی ضامن بڑی حد تک خود ہماری سوسائٹی کی لغو و مہمل رسمیات ہے یہ تو لکھا جا چکا ہے کہ خواجہ نذیر حسن کے والد ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی سید تھے لیکن ان کی والدہ کو نہ تو سید خاندان سے تعلق تھا نہ صدیقی یا فاروقی نسل سے خواجہ نذیر کے نانا اکبر علی خاں افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا موطن "زمانیا" تھا جہاں کے باشندے اپنی نسلی خصوصیات کے باعث ہندوستان میں نہایت معزز و مشہور ہیں خواجہ نذیر کی والدہ کے خالو مہاراجہ صاحب ڈومراؤں کے یہاں ایک معزز عہدہ پر فائز تھے نذیر کے خالہ زاد داموں میوہ خاں بہت مشہور شخص گزرے ہیں جنکے رشتہ دار ابھی تک ڈومراؤں وغیرہ میں موجود ہیں الغرض ماں کی طرف سے نذیر نہ سید تھے نہ صدیقی نہ فاروقی، جہاں تک میں نے خواجہ نذیر مرحوم کی نکبت و پستی پر غور کیا اس کا اصل راز ان کی جہالت کے ساتھ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آپ کی والدہ غیر برادری کی عورت تھیں، ہندوستان کے قرشی اصل مسلمان اپنی جماعت کے اس فرد کو عضو معطل کی طرح برطرف کر دیتے ہیں جس نے غیر برادری میں شادی کی ہو واقعہ یہ ہے کہ جو افکار میں اس مقالہ کے اندر پیش کرنا چاہتا ہوں وہ بڑی حد تک خواجہ نذیر ہی کی زندگی سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں،

میرا قاعدہ ہے خواہ آپ اسے کم یا سمجھیں کہ میں پہلے نہ کفر کو دیکھتا ہوں نہ اسلام کو، نہ کسی کے تقدس ظاہری سے متاثر ہوتا ہوں نہ کسی کی خاندانی عظمت و ثروت سے بلکہ سب سے انسان کی رفتار و گفتار، حرکت و سکون کو اندر "صورت حال" کا مطالعہ کرتا ہوں میرے والد مرحوم کی وفات اس وقت ہوئی جبکہ میں دس سال سے کچھ ہی بڑا تھا خواجہ نذیر مرحوم والد مرحوم کی زندگی میں بھی میرے ہی یہاں رہتے تھے اور مدوح کی وفات کے بعد مجھے

مُسلل بیس سال تک آپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، میں نہیں کہہ سکتا اس انسان کے سینہ میں کیسا دل تھا، مزاج نہایت نیک، طبیعت حد درجہ ملنسار، گفتار و کردار کے ہر پہلو میں محبت و دلجوئی، وسعت قلبی کا یہ عالم کہ سب کی بھلائی کے خواہاں، اور ان تمام محاسن اخلاقی سے بڑھ کر آپ میں دردمندی کی صفت تھی اپنے بیگانے سب کی مصیبت میں برابر کے شریک رہا کرے آج ہزاروں انسان اپنے علم و فضل اپنی قومی و ملی خدمات اپنی خاندانی و ذاتی بزرگی کے لحاظ سے عوام میں عزیز اور محترم بنے بیٹھے ہیں لیکن ذرا ان کی پرائیوٹ زندگی پر غور کیجئے، بچے ناخوش، بیوی نالاں، خدمتگار فریادی پڑوسی بدگمان ملنے والے شاکی، احباب سے پوچھئے تو سارے تقدس، عبادت و ریاضت قومی دردمندیوں اور ملی خدمت گزاروں کی حقیقت کھل جائے، نذیر کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس افتادگی و بیچارگی کے اندر صفت ملکوتی کا وجود بھی ہوگا، آپ کی زندگی سنائی کے اس نظریہ کی تصدیق کرتی تھی ”مایہ دل ز آب و گل نبود“ نہ وہ صوفی صافی تھے نہ زاہد شاغل، سطور بالا میں عرض ہی کر چکا ہوں طفولیت عیش و نشاط اور ناز و نعم میں گزری، عہد شباب مصیبت کوشیوں کی ”نذر ہوا“ وسط عمر سے لے کر ضعیفی تک ”غم روزگار“ میں چور رہے، با اینہم وہ سینہ میں ایک ایسا دل رکھتے تھے جس کی روشنی مدت کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی شاید خاص ہی خاص سینوں میں دمک سکتی ہے ستائی کا فلسفہ ہے

از در تن کہ صاحب کلمہ است

تا بدل صد ہزار سالہ رہست

آپ کی زندگی کے واقعات بہت ہیں لیکن مجھے یہاں سے بحث نہیں میں تو یہاں پر صرف سوسائٹی کے اس ”نقش باطل“ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس نے نذیر جیسے خلیق اور ”دل والے“ انسان کو افتادہ و ہیج بنا کر رکھا اور انھوں نے عمر کی خطرناک اور دشوار گزار وادیاں طے کر کے اسی کس میرسی میں، اپنی اکثر امیدوں کے خون ہوتے کے بعد پورے ایک سال تک مرض سرطان کی پذیرائی در دکرے کرتے ۱۳ دسمبر بروز سینچر سنہ ۱۹۳۱ء بوقت دس بجے دن ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں، آہ نذیر! تم دنیا میں نہ رہے لیکن تمہارا افسانہ درد دنیا میں باقی رہے گا، تمہاری ہمدردی کو دنیا باوجود کوشش بھی نہیں بھلا سکتی ہر مصیبت کے وقت تم یاد آؤ گے آنکھیں تمھیں... ڈھونڈیں گی لیکن نہیں پائیں گی مجروح حیات تمہارا ماتم کریں گی مگر تمھیں کیا خبر کہ تمہارے بعد تمہارے لئے بہت سی رونے والی آنکھیں ہیں بہت سے دردمند دل ہیں جو زندگی میں بھی تمہارے قدردان تھے اور بعد مرگ بھی تمہاری جدائی میں خونبار ہیں، اے مرغِ سدرہ نشین! عالم ملکوت کا نشیمن مبارک، تم دنیا سے آب و گل میں فطرت کے مظالم سہتے رہے، سب کے درد و دکھ میں شریک رہے، یتیموں اور بکیوں کی دستگیری کی، دل میں بہت سی سربستہ آرزوئیں رکھتے تھے، افسوس، نہ تمہاری تمنائیں نکلیں نہ دوسروں کی جو تمہاری ذات

کے ساتھ وابستہ تھیں، خیر مرنا سب کو ہے اور اس لئے تمھارا مرنا بھی جا بجا تھا کچھ دنوں اور زندہ رہ جاتے تو ہر چند ”رونق ہستی“ میں نہ کوئی دقیقہ اضافہ تھا نہ قابل ذکر خلل، لیکن فطرت کی بولمونیوں کب اس کو گوارہ کرتی ہیں۔

انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں

فہرست مآخذ | اگر ہم مطالعہ کرنا چاہیں کہ موجود انسانی نسلیں ابتدائے آفرینش سے اسی ایک حالت میں ہیں یا ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کر کے مختلف قوموں کے ساتھ خلط و آمیزش اثر و تاثر کے بعد موجودہ صورت میں پائی جاتی ہیں؟ اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں کہ نسب و حسب کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کونسا نفسیاتی نتیجہ ہے جو ہمیں خاندانی نجابت پر فخر کرنے کے لئے بے چین کر دیتا ہے؟ تو ہمیں مختلف علوم و فنون سے مدد لینا پڑیگی۔ درہم فلسفہ و سائنس، تاریخ و ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے مجبور ہیں انسان کی نسلی تقسیم ان کی مختلف نسلی آمیزش، موجودہ اقوام کی نسلی خصوصیات ان کے مقامات سکونت ان کی طرز معاشرت کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم علم الانسان (ANTHROPOLOGY) کا مطالعہ کریں علم الاقوام (

پر غور کریں، اٹھنا گرائی کو پیش نظر رکھیں، اسی طرح فلسفہ و نفسیات کے ذریعہ ہم اس بات کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کونسا ذہنی رجحان ہے جس کے نفسیاتی تجزیہ سے ہم انسان کے خاندانی فخر و مباہات کی حقیقت دریافت کر سکتے ہیں، تاریخ ہمیں بتائے گی کہ سیاسیات نے کس طرح ذلیل افراد اور پست اقوام کو عزت و شرافت کے آسمان پر پہنچا دیا اور کس طرح شریف و نجیب افراد یا قومیں فخر مذلت میں گر کر فنا ہو گئیں ادب کے ذریعہ ہم انسان کے ادھام نسب کے متعلق بہت سی پُر لطف معلومات حاصل کر سکتے ہیں تو یہ کہہ نہیں سکتا کہ مفصلہ بالاعلوم کی تمام کتب متداولہ کامیاب نے غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجھے ان تمام علوم کے متعلق کثیر کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا

امریکین علمائے انسانی مصروفیتوں پر توجہ کرتے ہوئے سائنس کے ان دقیق مباحث کو جو انشاکی تولیدگی اور علمی اصطلاحات کے باعث عوام کے لئے ناقابل فہم بن جاتے ہیں، نہایت شگفتہ اور سلیس عبارت میں ایک کتاب موسومہ ”علوم حکمیہ بہ عہد جدید“ (SCIENCE IN MODERN TIMES) کے اندر جمع کر دئے ہیں یہ

کتاب چھ جلدوں میں ہے اس کے مدون انیسورتھ (AINS WORTH) ہیں اس کتاب میں ہیئت،

طبقات ارض نباتات، علم حیوانات، علم الانسان، حیاتیات، علم برق، طبیعیات وغیرہ سائنس کی تمام شاخوں پر بسیط بحثیں ملتی ہیں۔ میں نے علم الانسان کے متعلق اسی کتاب سے مواد حاصل کئے ہیں عربی زبان میں بھی ہمارے علمائے اسلام نے انساب اور علم الاقوام کے متعلق قابل قدر کتابیں چھوڑی ہیں چنانچہ مورخ امیر علی نے مسعودی

کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اہل یمن کے باشندوں کی قومیت (ETHNOLOGY) اور مختلف قبائل کے مقامات سکونت (ETHNOGRAPHY) کے متعلق بہت مفید معلومات جمع کر دیئے ہیں۔ اسی طرح علامہ ابن حزم نے ”جمہرۃ الانساب“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں عرب و بربر قبائل کے انساب درج ہیں اور عربوں کی ان شاخوں کے متعلق جو مغرب میں ہیں خاص خاص حوالے ہیں ابن خلدون نے اس کی بڑی تائید کی ہے، ایچ بنز (H. Ben) جو مقررہ نئی ”تاریخ فاطمیہ“ کے مدون ہیں اس کا نام کتاب الجہاہری انساب المشاہیر بتاتے ہیں اس کا ایک حصہ ”جمہرۃ النسب“ کے نام سے پٹنہ اور ٹیٹل لائبریری میں موجود ہے۔ عربوں کو قدیم زمانہ سے علم الانساب سے خاص شغف تھا اسلام کے بعد بھی یہ ذوق غالب رہا اور اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، ابن طباطبائی، نجفی عمری، عمیدی، ابدالی، ابن میمون، واسطی اس فن کے بڑے ماہر تھے۔ اور ان کی کتابیں بہت مستند اور مقبول ہیں مفصلہ ذیل علماء اور ان کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔

نام کتاب

اسماء علماء

الثبت المصان
المشجر الکشاف الاصول السادة الاشراف

ابو النظام مؤید الدین عبید اللہ الحسینی الواسطی
محمد ابن احمد العمیدی الحسینی

ابو عبد اللہ حسین ابن محمد طباطبائی

ابو القاسم حمزہ الدینوی

زید بن علی بن حسین بن زید بن علی امام زین العابدین

سید احمد عمید الدین النجفی

عز الدین ابو الحسن علی بن محمد الاثیر الجزری

کتاب اللباب
سید احمد رفاعی کے سلسلہ نسب
مناقب میں

امام تقی الدین عبد الرحمن ابو الفرج بن عبد الحسن الواسطی الشافعی
ابو الحق ابراہیم محی الدین ابن شیخ ابو الفتح عمر الفاروقی گازرونی
قاسم بن محمد واسطی شافعی

تراق المجین

النفحة المسکية

بغیة الطالب

۱۔ ہسٹری آف دی سرائنر ۲۔ انسائیکلو پیڈیا آف راجن اینڈ اٹھلس ”مقالہ ابن حزم“

۳۔ ان تمام مشجرات (انساب کی کتابیں) اور نسابین کا تذکرہ ”صحاح الاخبار“ کے مصنف علامہ سراج الدین رفاعی نے کیا ہے

۴۔ سادات طباطبائی کا سلسلہ یہ ہے ابراہیم طباطبائی بن ابراہیم الغمر بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب

لیکن میں نے انساب اور علم الاقوام کی ان انجمنوں میں بڑی نافی الحال مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں اس وقت جس زاویہ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے ”علم الانسان“ کی بحث کافی ہے جس میں علم الاقوام کی بحث بھی آگئی ہے۔

نفسیات کے متعلق میں نے میک ڈاؤگل، جیمس، غزالی وغیرہ سے معلومات حاصل کئے اور انھیں کے نفسیاتی نظریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کے جذبات ”انانیت“ (Positive self feeling) اور ”انکسار“ (Negative self feeling) کے تحت فخر و تنبی پر غور کیا،

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مجھے تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، چنانچہ تخیل نسب پر سیاسیات کا اثر والا عنوان محض کتب تاریخ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، یوں تو سلاطین دکن کے حالات میں زیادہ تر میں نے تاریخ فرشتہ سے مدد لی ہے لیکن عادل شاہیہ کے متعلق ”لسبائین السلاطین“ مصنفہ محمد ابراہیم الزبیری (قلمی نسخہ پٹنہ لاہوری) اور قطب شاہیہ کے تذکرہ میں ”تاریخ محمد قطب شاہ“ (قلمی نسخہ پٹنہ لاہوری) سے بھی مدد ملی، اسی طرح خلجیہ اور سید خاندان (دہلی) کے متعلق فرشتہ کے علاوہ ”بحر المواج“ مصنفہ محمد علی خاں انصاری (قلمی نسخہ پٹنہ لاہوری) اور منتخب التواریخ بدایونی سے بھی معلومات حاصل ہوئے علویہ کا تذکرہ فرشتہ نے ضمنی طور پر برہان نظام شاہ کے سلسلہ میں کیا ہے میں نے یہیں سے لیا ہے، لیکن امیر علی کی ہسٹری آف دی سرائسٹریز میں مورخین اسلام کی روایت سے جو مخالف روایت ہے، وہ بھی نقل کر دی، صفویہ کے حالات بھی فرشتہ سے لئے ہیں ”عرفات العاقین“ نقی اوصدی میں بھی شیخ صفی الدین اردبیلی کے ذیل میں صفویہ کا تذکرہ ملتا ہے مغلیہ کے حالات میں میں نے ”جام جم“ مرتبہ سید احمد خاں سے مدد لی ہے،

اہل بیت کے حالات یوں تو تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں امین رازی نے ”ہفت اقلیم“ میں اور سید نور الدین سید شریف حسینی مرعشی شوستری نے مجالس المومنین“ (قلمی نسخہ پٹنہ لاہوری) میں تفصیل کے ساتھ آئمہ معصومین کے حالات لکھے ہیں اسی طرح ابن خلکان کی ”وفیات الاعیان“ (انگریزی ترجمہ ڈی سلین پٹنہ لاہوری) کے اندر بھی آئمہ معصومین کے حالات درج ہیں لیکن ان تمام کتابوں میں مادری سلسلہ نسب کا تذکرہ نہیں اس لئے باوجود ورق گردانی یہاں سے واقعات نہیں ملے، آئمہ معصومین اور اہل بیت اطہار کے مادری سلسلہ نسب کے متعلق جو حالات میں نے مرتب کئے ہیں وہ مفصلہ ذیل کتب سے مانوڑ ہیں

ترجمہ کشف النعمۃ: اصل کتاب عربی زبان میں تھی اس کے مصنف ابوالحسن علی بن سعید فخر الدین عیسیٰ بن ابی ابراہیم علی بن حسن الزواری نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا، (قلمی نسخہ پٹنہ لاہوری)

غایۃ الہمہ فی ذکر الصحابہ والاعظمہ: مصنفہ محمد علی محمد بیانی ”فضل الہ آبادی بن شیخ محمد موسیٰ (قلمی نسخہ)

تذکرۃ الائمہ = میر محمد باقر مجلسی اصفہانی (قلمی نسخہ)

الارشاد = محمد بن محمد بن نعمان معروف بہ شیخ مفید (قلمی نسخہ)

سابق الذکر تینوں کتابیں فارسی زبان میں ہیں، "کشف الغمہ" اور "غایت الائمہ" میں نہایت سنجیدہ مباحث ہیں لیکن میر محمد باقر مجلسی چونکہ شیعہ عالم تھے اس لئے انھوں نے تاریخی بیان میں اگر ایک طرف تحقیقات سے کام لیا ہے تو اسی کے ساتھ فرقہ دارانہ عقیدتوں کی بھی مخلوط کر دی ہیں چونکہ انھوں نے ائمہ معصومین کے سلسلہ میں ہر امام کے متعلق لکھا ہے کہ زبور میں آپ کا فدا نام ہے، توریت میں فلاں نام ہے، انجیل میں فلاں لقب ہے، آخری کتاب "الارشاد" عربی زبان میں ہے اور خوب، ائمہ معصومین کی اولاد و احیاء کے حالات تفصیل سے اسی میں ملتی ہیں مفصلہ بالا کتاب میں مجھے پٹنہ لاہوری سے ملیں حال میں اس فن کی ایک نہایت مستند اور مکمل تصنیف دستیاب ہوئی اس کا نام "صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار" ہے اس کے مصنف ابوالمعالی محمد سراج الدین الرفاعی مخزومی ہیں ۹۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۲ برس کی عمر میں بغداد کے اندر ششہ ۱۰۰۰ھ میں وفات پائی، والد کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت موسی کاظم تک منتهی ہوتا ہے، سعدیہ بنت امیر عبد الرحمن مخزومی خالہ (حاکم نجد) آپ کی والدہ تھیں اس لئے آپ مخزومی بھی کہلاتے ہیں اپنے زمانے کے بڑے عالم اجل اور عارف باہر گذرے ہیں، آپ نے مختلف علم و فن کے متعلق کتابیں چھوڑی ہیں، جن میں مفصلہ ذیل تصنیفات قابل ذکر ہیں

تفسیر
حدیث

البيان فی تفسیر القرآن

سلاح المؤمن

النسخۃ الکبری

جلال القلب الحزین

تصوف

ان کے علاوہ آپ نے شعر و سخن اور درود و وظائف کے متعلق بھی مفید رسائل لکھے تھے،

"صحاح الاخبار" سے آپ کی کثرت مطالعہ، قوت حافظہ، وقت نظر، اور سلامت طبع پر گہری روشنی پڑتی ہے، آپ نقاد فن نسابہ گزرے ہیں اور اکثر ان مباحث کے متعلق جو نسابین کے درمیان متنازع فیہ ہیں نہایت لطیف نکتہ سنجیاں کی ہیں جو نہ صرف تاریخی تحقیقات کے اعتبار سے قابل قدر ہیں بلکہ معقولات کی روشنی میں بھی نہایت دقیق ہیں مثلاً ابن طباطبایہ اور اس کے شاگرد ابن معیہ (شیعی نسابہ) نے سادات رفاعی پر (جو سنی المذہب تھے اور جن میں مصنف بھی شامل ہے) جو نسبی اعتراض کیا ہے، اس کا نہایت معقول جواب دیا ہے، اسی طرح حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے ہاشمی النسب ہونے کے متعلق نسابین کو اختلاف ہے، اس مسئلہ پر بھی مصنف نے نہایت عالمانہ و محققانہ بحثیں کی ہیں کتاب کے نصف آخری حصہ میں سادات رفاعی کے

حالات مندرجہ ہیں اور نصیحت اول حصہ میں علویین، ائمہ معصومین اور ان کی اولاد امجاد کا تفصیلی تذکرہ ہے،
نسل انسانی پر عمومی نظر | ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ دنیا میں بہت سے ایسے خیالات مروج ہیں جن کا حقیقت
 سے کوئی علاقہ نہیں لیکن وہ ہمارے ذہنی رجحانات کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور طرفہ یہ کہ تاریخی شواہد اور عقلی دلائل کے باوجود
 ہم اپنے اس مرکزی خیال کو ذہن سے مسترد نہیں کرتے، ڈاکٹر ابراہیم نے جنون کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
 داغ کے اندر کوئی ایسا خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اس کے حق و بطلان کے متعلق نہ ہم خارجی معلومات کی بنا پر فیصلہ
 کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کے دلائل و براہیں سے اثر پذیر ہو کر اپنے مرکزی خیال میں ترمیم کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں
 نسلی امتیاز اور شرافت نسبی کا فخر بھی انسان کے انھیں چند ذہنی مغالطات میں سے ہے، جنھیں اصطلاح میں ”جنون“
 کہا جاتا ہے علم الانسان ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی خالص نسل کی قوم باقی ہے، نہ سیاسی تحریکوں اور قومی یورشوں
 سے کوئی قوم نسلی اختلاط سے بچ سکتی تھی، ماہرین علم الانسان نے اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی ہے وہ حسیل یہ ہے
 کہ رضی کی موجودہ بسنے والی قوموں اور ان کے باہمی نسلی علاقوں کا مطالعہ اور تحقیق کے لئے یہ فیصلہ کرنا ضروری
 ہے کہ کونسی خصوصیات کی بنا پر قومی علامت اور نسلی تشخیص متعین ہو سکتی ہے، کسی مخلوط قوم میں (اور تمام زندہ
 قومیں مخلوط ہیں) نسلی خلط کی چھتیاں کا سمجھنا آسان نہیں لیکن پھر بھی بہتر ہے افراد کی خصوصیتوں کا بغور مطالعہ کرنے
 کے بعد تحقیقی نتائج مرتب ہو سکتے ہیں خصوصیات جسمانی کے علاوہ، عادات و خصایل، زبان و تربیت قابل لحاظ امور ہیں،
 ان کے علاوہ روایات اور تاریخ سے کافی مدد مل سکتی ہے، سب سے پہلے ان خصوصیات و لوازم پر غور کرنا ضروری
 ہے جو ماہرین علم الانسان کی تحقیقات کا موضوع ہیں

ایک معمولی محقق انسان کی ظاہری خصوصیات کے بعض عناصر کو نسلی علامت کے لئے لازم قرار دیتا ہے،
 جسمانی رنگ ظاہری خصوصیت ضرور رکھتا ہے، لیکن نسلی تحقیق کرنے میں اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، بال کا رنگ
 اور آنکھیں یورپ کے ”حسینان صبح“ (FAIR WHITES) کے باہمی علاقوں کا مطالعہ کرنے میں
 زیادہ قابل عمل ہیں چونکہ اور جگہ عام یک رنگی پائی جاتی ہے، دوسری قوموں میں بال اور آنکھیں عموماً سیاہ ہوتی ہیں
 ایک خصوصیت جو انسان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے، ”بال“ کی خصوصیت ہے، قسط الشعر
 (ULOTRICH) یا ”اونی بال والی قوموں“ میں بہترے گھنے پیچدار بال پائے جاتے ہیں اس قسم کا
 بال لانا ہوتا ہے جیسے، ”پیپوئیس“ (PEPUANS) قوم میں، چھوٹا ہوتا ہے، جیسے حبشیوں میں اور
 بالکل چھوٹا ہوتا ہے جیسے ”بن مانس“ (BUSH NIEN) اور قصیر القامت مشابہ حبشی اقوام...

ڈاکٹر ابراہیم کے اس فلسفہ پر میں نے اپنے مضمون ”مئے مجاز و حقیقت کے دو جہے“ کے اندر بحث کی ہو دیکھے صوفی بابت اگست ۱۳۱۲ء

(NEGROES) میں، مانج الشعر (CYMOTRICHI) قوموں میں لہرتا ہوا بال پایا جاتا ہے، یا یہ کم و بیش کامل طور پر مجعد اور سچاں ہوتا ہے، سبط الشعر (LEIOTRICHI) یا ”سیدھے بال والی قوموں“ میں بال عموماً سر سے سیدھا کرتا ہے، یہ قابل یادداشت بات ہے کہ قطع و برید میں ”اوتی بال“ بیضاوی اور عریض ہوتا ہے، اس کے برخلاف سیدھا بال مدور (گول) ہوتا ہے،

قامت کی خصوصیت بھی قابل لحاظ امر ہے، کسی قوم کا اوسط قد پانچ فٹ چھ انچ ہوتا ہے، جن قوموں میں اوسط چھ فٹ آٹھ انچ پاتا جاتا ہے وہ دراز قامت قومیں ہیں جس قوم کا اوسط پانچ فٹ چار انچ ہوتا ہے وہ قصیر قامت کہی جاتی ہیں،

سر کی عام شکل، کاسہ وماغ، ناک کی وضع، لب کی ہیئت اور موٹائی قابل غور ہیں، الٹی ہوئی ٹھوری، آگے نکلا ہوا جبر، ابرو کے اونچے، حصے دبی ہوئی پیشانی وہ خصوصیات ہیں جو نوع انسان کے نیچے طبقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں،

اوپر بیان کی ہوئی خصوصیات ایک حد تک بغیر کسی مساحت کے معلوم ہو سکتی ہیں لیکن طبیعیات کا ماہر صرف تخمینہ پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ وہ طول اور زاویوں کی مساحت کرتا ہے، اور مقدار و وزن کو جانچتا ہے، اکثر ماہرین علم الانسان نے تجربہ اور تحقیق کے لئے سر کے پچھلے حصہ سے آگے حصہ تک کا طول و عرض ناپا ہے، اسے ”مساحت جہر“ (CEPHALIC OR CRANIAL INDEX) کہتے ہیں ایسے افراد یا قوموں کو جن کی کھوپڑیوں کے عرض اور طول میں ۷۵ اور ۱۰۰ کا فرق ہے، (یعنی عرض بمثلہ ۷۵ ہے اور طول بہ منزلہ ۱۰۰) ”طویل الجماجم“،

(DELICOCEPHALIC) ”لابیہ یا تنگ سروالے“ کہتے ہیں جب عرض اور طول میں ۸۰ اور ۱۰۰ کا فرق ہوتا ہے تو ایسی قوموں کو قصیر الجماجم، (BRACHYCEPHALIC) یا ”پھوٹے اور چوڑے سروالی“ کہتے ہیں اور جب سر کے طول و عرض میں ۷۵ اور ۸۰ کا فرق رہتا ہے تو ایسی قوموں کو وسط الجماجم (MESATECEPHALIC) یا ”اوسط سروالی“ کہتے ہیں، ایک خطہ کے کثیر آدمیوں کی کھوپڑیاں اگر ناپی جائیں تو یا تو وہ قصیر الجماجم ہوں گے یا

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا حلیہ مبارک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کان ربعة من القوم ليس بالطول ولا بالقصر اذ هو اللون ليس بابيض اصمق ولا ادم ليس بمجعد قطط ولا سبط رجل (آپ میانہ قامت تھے نہ بہت لمبے نہ ٹھنکے سفید رنگ نہ ایسے بالکل سفید نہ بالکل گندم گوں (در رنگ) نہ سخت گھونگھر بال وائے نہ بالکل سیدھے بال بالے (بخاری کتاب المناقب)

میں نے بال کے متعلق اصطلاحات اسی حدیث کی مدد سے وضع کی ہیں قطط الشعر، اور سبط الشعر الفاظ اسی حدیث سے ماخوذ ہیں ع۔ م

طویل الجراح یا وسیط الجراح لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک قوم بلکہ ایک قبیلہ کے محدود دائرہ میں یہ تینوں مختلف اقسام ملتے ہیں یہ اختلاف نتیجہ ہے ایک نامکمل نسلی آمیزش کا بعض جدید محققین ”مساحت ججر“ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، دوسری صورت جہاں مساحت سے کام لے سکتے ہیں ”ججر کی وسعت“ ہے اس کا قاعدہ یہ ہے کہ کھوری کے خول میں چھوٹی چھوٹی گولیاں یا دانے بھر دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداءً ججر کے اندر مغز کی کتنی مقدار تھی لیکن یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ ”وسعت ججر“ کے تخمینہ سے دماغی استعداد کا صحیح معیار قائم نہیں کر سکتے، (باقی آئندہ)

عبدالملک آروی

کابل - سرمہ چورن - منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظیات میں ظاہر کی ہے۔ دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:- سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھجرت بنے۔

کابل { آشوب، سرخی، ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے۔ ایک ڈبہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے قیمت ایک روپیہ عہد سید رضا نیر سو پنتھن (لوٹ محل)

سرمہ { یہ ہمیشہ ہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ نمیرہ ہے نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالاؤ ہند موتیابند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ ایک روپیہ علاوہ محصول

چورن { یہ وہ آسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے، پیٹ کا درد، قبض، نفخ ریاہ کا پید ا ہونا، سوزہضم و متوکا سنا آنا، سب ایک تخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھالینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ عہد ایک روپیہ علاوہ محصول

منجن { اسکی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ملتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ ایک روپیہ علاوہ محصول

نوٹ:- سب چیزیں منگانیو الو نکو محصول اک معاف۔ مہینہ۔ دقت رسالہ نگار لکھنؤ۔ پتھر۔

بالشوہک شاہزادی

عمارہ کی چھاؤنی میں روہی فوج کے افسر اعلیٰ کا دفتر، جس کے وسط میں ایک میز پر ٹیلیفون، قلمدان اور سرکاری کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ میز کے سامنے جنرل کے لئے ایک آرام کرسی چھپی ہوئی ہے۔ کرسی کی پشت پر ایک کھڑکی ہے۔ کھڑکی کے محاذ میں میز کے آگے ایک سادی لکڑی کی بیچ ہے۔ میز کے داہنی جانب ایک اور معمولی کرسی پڑی ہے جس کی پشت دروازے کی طرف ہے۔ دروازے کے برابر، بیچ کے آخری سرے پر ٹوپیاں اور کوٹ لٹکانے کے لئے ایک چوبلی ”ریک“ استادہ ہے۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔

جنرل فرامرز، لفٹنٹ شہباز کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور دونوں اپنے اپنے لبادے اور ٹوپیاں اتار کر ”ریک“ پر لٹکا دیتے ہیں۔ شہباز کو ذرا دیر لگتی ہے۔ جنرل اپنی کرسی سرکا کر فوراً اُسے آواز دیتا ہے :-

”شہباز!“

شہباز۔ ”جی حضور!“

جنرل۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) تم نے وہ رپورٹ گورنمنٹ کو بھیج دی؟
شہباز۔ (میز کے قریب آتے ہوئے) ابھی کہاں؟ اس میں دریافت طلب بات یہ ہے کہ آپ اُسے کون سی گورنمنٹ کو بھیجنا چاہتے ہیں؟ (یہ کہتے ہوئے وہ برابر والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
جنرل۔ اس کا فیصلہ تمہاری عقل عامہ پر تھا۔ جو گورنمنٹ قیاساً کل صبح برسر اقتدار ہونے والی ہو، اسے بھیج دو۔

شہباز۔۔۔ اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ "مشروطی گورنمنٹ" کل تک برسرِ اقتدار تھی لیکن آج سنا ہے کہ وزیرِ اعظم نے پستول سے خودکشی کر لی اور انتہا پسند جماعت کے سردار نے باقی ماندہ وزراء کو رافیل کی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

جنرل — خیر..... یہ بھی اچھا ہوا، لیکن یہ لوگ بالعموم نمائشی کار توں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے یقین نہیں آتا۔

شہباز۔۔۔ بہر حال، نمائشی کار توں بھی شکست دینے ہی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اب میرے خیال میں تو ”فرغول یارٹی“ کے پاس ریپورٹ بھیج دی جانی چاہئے۔

جنرل — اُن سے زیادہ تو ”شاوین“ کی پارٹی مضبوط ہے۔ اور ان دونوں پر اگر کسی کو سبقت لے جانے کا موقع ہے تو وہ ”سرخ اعتدال پسند انقلابی“ ہو سکتے ہیں۔

شہباز۔ — بہر نوع یہ مسئلہ اس طرح حل نہ ہوگا، میں ٹائپ رائٹر میں کاربن لگا کر چار پانچ کاپیاں رپورٹ کی تیار کئے لیتا ہوں اور ہر ایک جماعت کے پاس ایک ایک کاپی بھیجے دیتا ہوں، اب جو جماعت بھی برسرِ اقتدار ہو۔۔۔!

جنرل — فضول کا غذات خراب کرنے ہیں، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم مدرسے کے بچوں کے پاس رپورٹ کی
کاپیاں بھیج دو — خدا کی نیناہ !!

(وہ پریشان ہو کر میز پر اپنا سر جھکا دیتا ہے)

شہباز — شاید آپ تھک گئے جنرل صاحب؟

جہن — آہ شہباز — شہباز! اے کس طرح زندہ رہنا گوارا کر رہے ہو؟

شہباز — کیا اس عمر میں جناب؟ . . . میں تو خود اپنے سے یہ سوال کیا کرتا ہوں کہ میں کس طرح مرنا گا اور اگر لوں گا؟

جہز — ہاں، شہباز تم ابھی نوجوان ہو، نوجوان اور بے حس۔ تمہارے احساس کو اگر کوئی چیز گریا سکتی ہے

صورتیں دیکھنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص الفاظ اور صرف الفاظ کے لئے کس طرح اپنا خون بہا دیتا ہے؟ ————— پھر الفاظ بھی وہ جو آوارہ واو باش، تجارت پیشہ یا بیکار مزدوروں کے گھڑے ہوئے الفاظ ہوں! کیا زمانہ آگیا ہے؟ دنیا بھر کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے!! (وہ فخر سے تنکر کہنے لگتا ہے)

بادشاہ کا وجود پر تو الٹی ہے، اس لئے نعمت ہے۔ وہ ایک حقیقت ہے اس لئے قابل قدر ہے۔ تم اُسے آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو، ہاتھوں سے چھو سکتے ہو۔ اس کے ہتھ میں تمہاری ستریں پرورش پائی ہیں اور اس کے غصہ میں تمہیں خدا سے خوف کرنے کا سبق ملتا ہے۔ میں اپنے آقا کے لئے اپنی جان قربان کر سکتا تھا بالکل اس طرح جس طرح میرے باپ نے قربان کر دی۔

تمہارے ”فاقہ مست بھائی“ (مزدور) ہمیشہ ہماری ٹھوکریں کھانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور ہمارے جوتوں کے پاس بیٹھ کر خوش ہوتے تھے! آہ اب زندگی میں کیا دل کشی باقی رہ گئی ہے؟! (ایو سائے طور پر آہ سرد بھرتے ہوئے)

میرا آقا ————— امارت عمارت سے اتار دیا گیا۔ اور عام قیدیوں کے گروہ میں کسی طرف بھیجا گیا۔ فوج جو اس کا سرمایہ افتخار و مسرت تھی، فاقہ مست باغیوں کی شرانگیز تقریریں سن رہی ہے اور ان کے اشارے پر بازاروں میں قواعد کرتی پھرتی ہے، اس شان کے ساتھ کہ خود کرنل مفسدہ پردازوں کی جماعت کا صدر بننے پر مجبور ہوتا ہے اور بادشاہ کے خلاف تقریر کرنے والوں کو پبلک سے روشناس کراتا ہے۔

میں خود اپنے مختار کے حکم سے کمانڈر اپنیف بنا دیا گیا ہوں۔ حالانکہ وہ خود ایک ذلیل یہودی ہے جو عیسائیت کے لئے باعث تنگ ہے۔ آہ! کل تک یہ باتیں دیوانے کی بڑبڑ بھی جاتی تھیں لیکن آج عام واقعات کی طرح نگاہوں کے سامنے ہیں۔ میں تو اب صرف اس لیے زندہ ہوں کہ دشمن کو شکست دیکر کسی نہ کسی طرح اپنے آقا کا اقتدار قائم کرادوں اور اس ذلیل یہودی کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ لوں۔ اس سے زیادہ اور کوئی تمنا نہیں ہے!

شہباز ————— ذرا سوچ سمجھ کر جنرل صاحب! آجکل ان خیالات کا اظہار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ فرض کیجئے میں ہی آپ سے غداری کر جاؤں! —————

جنرل ————— کیا؟
شہباز ————— آپ چونکے نہیں، میرا یہ ارادہ نہیں ہے اس لئے کہ خود میرا باپ اکثر اسی قسم کی بڑبڑ کا کرتا ہے لیکن فرض

تکھے اگر ایسا ہو جائے تو؟

جنرل — (طنز سے مسکراتے ہوئے) تم ابھی لڑکے ہو، میں اُلٹا تمہیں کو "انقلابی جماعت" کے خلاف مغویانہ خیالات پھیلانے کے جرم میں ماخوذ کر لوں گا۔ سمجھے صاحبزادے! اس کے بعد بلا کسی رسمی کارروائی کے تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے گا، بشرطیکہ تم مرنے سے قبل چلا چلا کر اپنی ماں سے آخری مرتبہ ملنے کی تمنا ظاہر نہ کرو۔ اس حالت میں بالکل ممکن ہے کہ ہمارے قابلِ نجات جج اپنی رائے قطعی بدل دیں اور تمہیں کسی فوج میں یک لخت کرنل بنا کر بھیج دیں! کافی باتیں ہو چکیں (وہ سینہ تان کر اٹھتا ہے) اب دفتر کا کام بھی ہونا چاہئے۔

(کاغذات میں سے ایک تار اٹھا کر پڑھتا ہے اور خوف سے لرز جاتا ہے)

"معاذ اللہ!" (کرسی پر بلا ارادہ بیٹھتے ہوئے) "یہ سب سے زیادہ صبر آزمایا بات ہے"

شہباز — کیا ہوا؟ — ہماری شکست کی خبر تو نہیں ہے؟

جنرل — خدا کی پناہ! نادان لڑکے کیا تیرا یہ خیال ہے کہ صرف شکست کی خبر مجھے اتنا پریشان کر سکتی ہے؟ مجھے — جو ابتدائے جنگ سے اب تک کم از کم تیرہ شکست کھا چکا ہے۔! —

آہ! میرے آقا، میرے نیکس آقا!!

(شدتِ غم سے اس کے آنسو نکل آتے ہیں)

شہباز — کیا مارے گئے؟!

جنرل — نہیں، مارا جانا کیسا ان کے قلب میں خنجر بھونک دیا گیا۔!!

شہباز — مجھے ہمدردی ہے!

جنرل — نہ صرف ان کے قلب میں بلکہ خود میرے قلب میں بھی خنجر پیوست کر دیا گیا! شہباز — اچھا! آپ استعارہ فرما رہے ہیں۔ خیریت گزری! میں تو سمجھا تھا کہ آپ کے آقاے نامدار کو واقعی کسی نے قتل کر دیا — ہاں تو کیا ہوا؟

جنرل — آہ اس کی لڑکی شہزادی زہرہ قدریکم جسے میرا آقا جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا وہ وہ

شہباز — خودکشی کر کے مر گئی؟

جنرل — نہیں، یہی ہوتا تو بہتر تھا — آہ بدرجہا بہتر تھا!!

شہباز — کیا مرتد ہو گئی؟

جنرل — (برافروختہ ہو کر) یقیناً نہیں۔ کفر نہ بکو شہباز!!

شہباز — (آہستہ لہجہ میں) کیا ووٹ مانگ رہی ہے؟!

جنرل — ووٹ!۔۔۔۔۔ آہ! میں اُسے اس فعل سے باز رکھنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے ووٹ دیتا، اگر وہ ووٹ چاہتی۔

شہباز — کس فعل سے باز رکھنے کے لئے جناب؟ صاف صاف کہئے آپ نے تو مہمہ بنالیا!

جنرل — (چپکے سے) وہ انقلابی جماعت میں شامل ہو گئی!

شہباز — کونسا گناہ کیا؟ آپ بھی تو شریک ہو گئے ہیں، ہم اور سب بھی تو شریک ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس کی شرکت بھی اس سے زیادہ اہمیت دیئے جانے کے قابل نہیں۔

جنرل — خدا کرے تمہارا خیال صحیح ہو۔ لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ وہ ایک نوجوان افسر فوج کے ساتھ فرار بھی ہو گئی ہے۔!! خیال تو کرو وہ اور ایک معمولی افسر فوج کے ساتھ فرار ہو جائے!!

شہباز — (کوئی خاص اثر نہ لیتے ہوئے) بجا فرمایا!

جنرل — شہزادی زہرہ قدر یکم! — حسن و محصومیت کا مجسمہ! — بہار شباب کی بولتی

تصویر! — امیرے آقا کی ناموس!۔۔۔۔۔ (وہ شرمندہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھاک لیتا ہے)

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔

شہباز — (رسیور اٹھا کر) ہاں۔۔۔۔۔ اعلیٰ جنرل کے دفتر سے۔۔۔۔۔ اتنے

زور سے چیخنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ بیشک میں اب جنرل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ تم

کون ہو؟۔۔۔۔۔ اچھا تو کیا تم بھی کرنل بنا دیے گئے۔ کیا واقعی؟۔۔۔۔۔ خوب!

۔۔۔۔۔ ہاں میں فیلڈ مارشل کے عہدہ پر ترقی پا چکا ہوں۔۔۔۔۔ نہیں

چارج نہیں لیا۔۔۔۔۔ تمہیں کیا کہنا ہے۔۔۔۔۔ سنو تم نے گھنٹی کس لئے دی

تھی، میں دفتر میں صرف تمہاری بڑ سننے کے لئے نہیں آتا ہوں۔۔۔۔۔ کیا؟

۔۔۔۔۔ شہزادی زہرہ قدر!۔۔۔۔۔ (جنرل فرامرز چونکتا ہے)

تم نے کہاں گرفتار کیا؟۔۔۔۔۔

جنرل — (شہباز سے رسیور چھین کر) ہاں، زور سے بولو!۔۔۔۔۔ میں ہی اعلیٰ جنرل ہوں۔۔۔۔۔

..... ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم کرنل ہو گئے ہو!..... لیکن تم نے اُس نوجوان سردار کو بھی گرفتار کر لیا جو اس کے ساتھ تھا..... بیحد کاہل ہو!..... تمہیں جواب دہی کرنا ہوگی..... نہیں یقیناً تم نے اُسے رشوت لے کر چھوڑ دیا..... میں باور نہیں کر سکتا، کم از کم تم نے اسے دکھا ضرور ہوگا، وہ اپنی مکمل فوجی وردی میں ہے..... بارہ گھنٹہ سے زیادہ کی مہلت نہیں دیا جاسکتی اس دوران میں بہر حال مفرد کو گرفتار ہو کر میرے پاس آ جانا چاہئے..... کیا کہا؟..... یہ غیر مہذب الفاظ کس کے لئے استعمال کر رہے ہو..... ایس؟

(شہباز سے مخاطب ہو کر) پاجی کا بچہ یہ کہہ رہا ہے کہ شہزادی شیطان مجسم ہے! (ٹیلیفون میں) نکمرا! نالائق! تجھے شہزادی زہرہ قدرنگیم کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات کہنے کی کیونکر جرات ہوئی!؟ میں.....

شہباز — (ٹیلیفون چھین کر) سوچ سمجھ کر جنرل صاحب! جنرل — سوچ سمجھ لیا..... میں اس بد معاش کو ضرور گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ ٹیلیفون رکھ دو! شہباز — لیکن شہزادی کا کیا حشر ہوگا؟ آپ نے یہ بھی سوچا!

جنرل — کیا؟ کیا؟..... شہباز — میرا مطلب یہ ہے کہ صرف آپ کی حفاظت میں شہزادی کی جان خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہے پہلے انھیں یہاں بلا لیجئے۔

جنرل — (رسیور کو شہباز کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) تمہارا خیال درست ہے۔ تم ہی اُس سے مہذبانہ گفتگو کر سکتے ہو..... میرے بس کی بات نہیں (بیٹھ جاتا ہے)

شہباز — (ٹیلیفون میں) ہلو!..... کچھ خیال مت کرو..... میرا ایک بے تکلف دوست تھا..... میں ذرا باہر چلا گیا تھا..... اُس کی عادت مذاق کی ہے۔ خیر اسے بھول جاؤ اور لڑکی کو فوراً یہاں بھیج دو..... یہاں ہم خود اسے تہذیب سے گفتگو کرنا سکھا دیں گے..... اچھا! کتنی دیر ہوئی؟..... تو پھر تم نے اول ہی کیوں نہ کہہ دیا اتنی دیر تک جھک جھک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ (ٹیلیفون رکھ کر)..... کیا مذاق ہے؟ شہزادی صبح ہی یہاں کو روانہ کر دی گئی ہے لیکن گھنٹہ بھر تک ٹیلیفون پر اس لئے جھک جھک کی جاتی ہے کہ یہاں اُنکے کرنل ہونے کی خبر سب کو معلوم ہو جائے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے شہباز پھرتی سے رسیور اٹھاتا ہے)

”اب کیا بات ہے..... اچھا!“ (جنرل سے) بیچے کی منزل سے ہمارے ہی اسٹاف کا آدمی بول رہا ہے..... (ٹیلیفون میں) سنبو جی! معمولی معمولی کاموں کے لئے بار بار ٹیلیفون استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں بیکار نہیں ہوں..... اچھا!..... اسے قابو میں رکھنے کے لئے کافی آدمی نہیں ہیں؟..... اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ (جنرل سے) شہزادی آپ جلی ہے۔

جنرل — انھیں حکم دو کہ فوراً اوپر بھج دیں..... (خود سے مخاطب ہو کر) مجھے بلا تعظیم و تکریم کے اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ بلا کسی رسمی استقبال یا دست بوسی کے!..... محافظ سپاہیوں کے سامنے کیونکر ضبط ہو سکے گا؟ بہر حال۔

شہباز — (ٹیلیفون میں) اسے اوپر بھج دو! (ٹیلیفون رکھ کر) ”وہ کہتا ہے کہ ہم شہزادی کو روک نہیں سکے اور وہ بلا اجازت محافظوں کو کھینچتی ہوئی اوپر چلی گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی!“ (شہزادی یکایک کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ دو پریشان اور خستہ محافظ پیچھے پیچھے اس کے بازوؤں کو مضبوط پکڑے ہائیتے کا پتے ہوئے برآمد ہوتے ہیں۔ شہزادی سر سے پاؤں تک سیاہ سمور کے لباس میں ملفوف ہے اور سمور ہی کی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہے۔)

شہباز — (بیچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ”قیام“ کے لفظ پر تمہیں اپنے قیدی کو بیچ پر بٹھا دینا چاہیے اور اس کے دونوں جانب خود بیٹھ جانا چاہئے۔ ”قیام!“ دونوں سپاہی شہزادی کو بٹھانے کے لئے پوری جدوجہد کرتے ہیں لیکن شہزادی ایک جھٹکے کے ساتھ دونوں کو اس طرح پیچھے ڈھکیں دیتی ہے کہ وہ دونوں بلا ارادہ بیچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود بھی اطمینان سے ان کے درمیان بیٹھ جاتی ہے۔ داہنا محافظ ایک ہاتھ سے شہزادی کا شانہ پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کاغذات پیش کرتا ہے۔ شہباز کاغذات کو لے کر جنرل کے آگے سرکادیتا ہے۔ جنرل متاثرانہ طور پر کھول کھول کر انھیں پڑھنے لگتا ہے۔

شہباز — خاتون قیدی! جب تک جنرل صاحب تمہارے معاملے کے متعلق کاغذات پڑھیں، تمہیں صبر و سکون کے ساتھ بیٹھا رہنا چاہئے۔ محافظ کو کیوں پریشان کر رہی ہو؟ شہزادی — (سپاہیوں سے) چھوڑو! (جنرل سے مخاطب ہو کر) ان سے کہو کہ میرے ہاتھ چھوڑ دیں ورنہ میں بیچ کو الٹ دوں گی اور ہم تینوں کے سر پھٹ جائیں گے۔

پہلا سپاہی — نہیں ننھی اماں! غریبوں پر ترس کھاؤ!

جنرل — (کاغذات کو ہٹا کر، گرجتے ہوئے) خاموش!!!

شاہزادی — (سرخ ہو کر) کون؟ میں یا سپاہی؟؟

جنرل — (سہم کر) تم نہیں خاتون، میں سپاہی سے مخاطب ہوں۔

شاہزادی — اُسے حکم دو کہ مجھے چھوڑ دے!

جنرل — بہادر سپاہیو! خاتون اس وقت تمہاری حراست میں نہیں ہے!

(سپاہی ان الفاظ کو سن کر شاہزادی کے ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک اطمینان کا سانس لے کر

اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے لگتا ہے، اور دوسرا اپنی کلائی چوسنے لگتا ہے)

شہباز — (افسرانہ لہجہ میں) "اٹنیشن!"

دونوں سپاہی مودبانہ پتھر کے بتوں کی طرح ساکت ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

شاہزادی — نہیں سردار صاحب! اس غریب سپاہی کو کلائی چوسنے دو۔ ممکن ہے اس میں سمیت پھیل جائے ہیں

بہت زور سے کاٹا تھا۔

جنرل — (تجربہ حیرت سے) ایس؟ کیا تم نے ایک ادنیٰ سپاہی کو کاٹنا گوارا کر لیا؟

شاہزادی — بیشک اس کے بعد مجھے افسوس ہوا اور میں نے زہر کی مدافعت کے لئے لوہے کے گرم گرم چمٹے سے

اس کے زخم کو داغنا چاہا مگر یہ گنوار ڈر گیا۔ اور کیا ہمدردی کی جاسکتی تھی۔

شہباز — خاتون! جنرل صاحب یہ پوچھتے ہیں کہ تم نے سپاہی کے کیوں کاٹا؟

شاہزادی — اس لئے کہ کسی دوسری تدبیر سے وہ میرے ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

جنرل — تو کیا جب تم نے اس کی کلائی میں کاٹ لیا اس وقت اس نے تمہیں چھوڑ دیا؟

شاہزادی — نہیں (سپاہی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے) یہ بہت وفادار سپاہی ہے اس خدمت کے صلے میں تمہیں اس

غریب کو ضرور کوئی معقول انعام دینا چاہئے۔ میں اس سے زیادہ یہی کر سکتی تھی کہ اس کا گوشت آمار لو

مگر یہ درندگی میں نے گوارا نہ کی اور چپکے چپکے اس کے ساتھ چلی آئی۔

جنرل — ملزم خاتون!

شاہزادی — فرامرز مجھے ملزم کہہ کر نہ پکارو۔ میری دادی نے تمہیں اپنے پیروں میں کھلایا ہے۔

جنرل — (آبدیدہ ہو کر) آہ خداوند! بالکل سچ ہے شاہزادی جو کچھ تم کہہ رہی ہو لفظ بہ لفظ سچ ہے

باور کرو کہ میرا دل ابھی تک وہی ہے جو اُس وقت تھا۔

شاہزادی — ہاں! بلکہ تمہارا دماغ بھی ویسا ہی پرانہ ہے جیسا اس وقت تھا۔ — بہر حال میں خود کو

تمھاری زبان سے ملزم کہنا واپس نہ نہیں کرتی۔

جنرل — لیکن میں تمھاری ہی بہتری کے لئے تمھیں ان قابل احترام خطابات سے مخاطب نہیں کر سکتا جنکی تم جانے طور پر اہل ہو۔ اس حالت میں تم اور کن الفاظ سے مخاطب ہونا پسند کرو گی؟

شاہزادی — ”القلاب“ نے ہمیں ایک دوسرے کا ”جان نثار“ بنا دیا ہے۔ مجھے ”جاں نثار“ کہو۔

جنرل — ان لغو الفاظ سے تمھیں مخاطب کرنے کے بجائے میں مرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

شاہزادی — تو پھر تم ”زہرہ“ کہو اور میں تمھیں ”چھٹنا“ کہوں جو میری دادی کہا کرتی تھیں۔

جنرل — (جذبات سے مضطرب ہو کر) شہباز! تمھیں ان سے گفتگو کرو مجھ میں گزشتہ یاد کو... تازہ کرنے کی

سکت نہیں ہے۔ (ان الفاظ کے ساتھ شرم سے اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے)

شہباز — (افسرانہ لہجے میں) عمارہ کی آزاد حکومت نے تمھارے والد امیر عمارہ کو معہ جملہ اہل خاندان چند مصلحتوں

کی بنا پر زبردستی رہنے کا حکم صادر کیا تھا۔ تم پر اس حکم کی خلاف ورزی کرنیکا الزام ہے!

جنرل — (شہباز کی گفتگو قطع کرتے ہوئے) یعنی تم..... مجھے کتنا چاہئے..... ایک سرکاری ملزم

کی حیثیت میں ہو۔ اس حالت میں مجھے تمھارے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔

شاہزادی — یہ بات تو میری گرفتاری سے قبل آپ کو سوچنا چاہئے تھی۔

جنرل — آؤ — آؤ — ذرا آگے آؤ، ملزم خاتون (آہستہ لہجے میں) تمھیں معلوم ہے کہ

اگر میں تمھیں زیادہ سخت الفاظ میں مخاطب کرنے پر مجبور ہوا تو تمھارا کیا حال ہوگا؟

شاہزادی — یہ تو مجھے معلوم نہیں ہاں یہ جانتی ہوں کہ تمھارا کیا حال ہوگا؟

جنرل — یعنی کیا؟

شاہزادی — یا تو تمھارے گلے میں خراش ہو جائے گی، یا کھانسی اٹھنے لگے گی!

(شہباز کے منہ سے بے ساختہ رے کے ہوئے فتنہ کی آواز نکل جاتی ہے جسے وہ کاغذات کی لوٹ پلٹ

میں ٹالنا چاہتا ہے لیکن جب ضبط نہیں ہوتا تو گرا ہوا کاغذ اٹھانے کے بہانے سے میز کے پیچے سر

جھکا کر ہنسنے لگتا ہے۔

جنرل — (گرج کر) لفٹنٹ شہباز!!

شہباز — (سر جھکائے ہوئے ہنسی سے بہکی ہوئی آواز میں) جناب! (میز کے جسم کے ہلنے سے لرزتی ہے)

جنرل — اوپر سر اٹھاؤ! — بیوقوف! تم نے تمام روشنائی بکھیر دی ہے! شہباز اوپر سر اٹھاتا ہی۔

اس کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے سے سرخ نظر آتا ہے۔

جنرل — ہنسو! خوب ہنسو! تم عالیجاہ شہزادی جہان پناہ کے مذاق سے کیوں لطف نہیں اٹھاتے؟
 شہباز — (یکایک متانت اختیار کر کے) مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔ جنرل صاحب!
 جنرل — نہیں، فوراً ہنسو! میں تمہیں ہنسنے کا حکم دیتا ہوں!
 شہباز — (اور بھی زیادہ متانت سے) میں واقعی نہیں ہنس سکتا جنرل صاحب!
 (بالکل فوجی انداز میں تن کر بیٹھ جاتا ہے)
 جنرل — (غصہ سے) اچھا! (پھر یکایک شہزادی کی طرف مخاطب ہو کر) کیا عالیجاہ شہزادی جہاں پناہ
 نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں انھیں ”جاں نثار“ کہہ پکاروں؟
 شہزادی — (بچ سے اٹھ کر ایک سرخ رومال ہلاتے ہوئے) بیشک! ”انقلاب زندہ باد!“
 ”جاں نثار“ فرامرز!
 جنرل — (گڑسی سے اٹھ کر فوجی سلام کرتے ہوئے) ”اشتر اکیٹ پائندہ باد!“ — شہباز
 تم اٹھ کر ”قومی ترانہ“ گادو!
 شہباز — (اٹھتا ہے) مگر جنرل صاحب نہ میرا گلا درست ہے نہ آواز۔ میں کس طرح گاسکتا ہوں؟
 جنرل — اچھا بیٹھ جاؤ اور اپنی شرمندگی کو ٹائپ کی مشین میں دن رات ٹکریں مار کر دور کرو!
 (شہباز بیٹھ جاتا ہے)
 جنرل — ”جاں نثار“ زہرہ قدر! تم کس نوجوان کے ساتھ فرار ہو گئی تھیں؟
 شہزادی — (حیرت سے) فرامرز! یہ کیا افترا پر داذی ہے؟ میں مطلق نہیں سمجھی!
 جنرل — انکار لا حاصل ہے! تمہاری نقل و حرکت اُسی نوجوان سردار کے پتہ سے معلوم ہوتی رہی ہے۔
 (شہزادی پر یکایک صورت حالات روشن ہو جاتی ہے اور وہ اس سے محفوظ ہوتی ہے جنرل فرامرز
 بدستور اپنی تقریر جاری رکھتا ہے)
 ”سب سے اول وہ ہانسیرگ میں تمہارے ساتھ ہوا۔ وہاں سے تم خفیہ پولیس کو دھوکہ دیکر نکل
 گئیں۔ لیکن نوجوان کو دوبارہ خفیہ پولیس نے زرو بہ کے مقام پر شناخت کیا۔ وہاں تک تم اُس کے
 ساتھ تھیں اس کے بعد تم تنہا اسکو کوروانہ ہو گئیں۔ معلوم نہیں اس کے بعد اُس بد قسمت نوجوان
 کا کیا حشر ہوا۔ کاغذات سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اب وہ کہاں ہے؟
 شہزادی — (بات کو اہمیت دینے کے لئے ذرا آہستہ لہجے میں) وہیں جہاں ہمیشہ تھا!
 جنرل — (اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے) یعنی؟ یعنی؟!

شاہزادی۔ (مسکراتے ہوئے) یعنی تمہارے دماغ میں اور کہاں؟ میں تنہا تھی، اور تنہا ہی آئی ہوں۔ ہانسبرگ سے
ماسکو کی طرف روزانہ سیکڑوں مسافر سفر کرتے ہیں مجھے کیا علم ہو سکتا ہے کہ ان میں کون کون تھا؟
جنرل۔ وہ عموماً اپنے عام لباس میں سفر کرتے ہیں کوئی بھی اپنی مکمل فوجی وردی میں سفر نہیں کرتا۔
شاہزادی۔ (جملہ پورا کرتے ہوئے) سوائے ان لوگوں کے جنہیں کسی شاہزادی کے بھگال جانے کا فخر حاصل ہو۔
جنرل۔ اور شخص کے ساتھ شاہزادیوں کا فرار ہونا ممکن نہیں۔

جنرل۔ خاموش بدتمیز!

(شاہزادہ نہایت ادب سے سر جھکا کر خاموش ہو جاتا ہے اور سیاہیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔
اس طرح گویا اُسے گفتگو سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ جنرل فرامرز کاغذات پر نظر ڈالتا ہے اور پھر بدلتا
شاہزادی سے جرح شروع کر دیتا ہے)

جنرل۔ ہاں تو اس نوجوان نے جس کا ان کاغذات میں حوالہ دیا گیا ہے۔ تمہارا پروانہ راہداری دکھا کر سفر کیا۔
اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

شاہزادی۔ لاحول و لا قوۃ! کتنی لغو بات ہے؟ ایک مرد ایک عورت کا پروانہ راہداری دکھا کر کس طرح سفر کر سکتا
ہے؟

جنرل۔ بالکل آسان ہے۔ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ جب مسافروں کا کوئی گروہ سرحد پر پہنچتا ہے تو افسر
متعلقہ ان سب کے پروانہ ہائے راہداری کی ایک جگہ جمع کر لیتا ہے پھر وہ انہیں گنتا ہے اور ان سے
آدمیوں کی تعداد کا مقابلہ کرتا ہے۔ اگر تعداد درست ہوتی ہے تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے اور پھر وہ بھی
یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ ان میں کتنے مرد ہیں اور کتنی عورتیں؟

شاہزادی۔ پھر تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک پروانہ راہداری میرا تھا؟

جنرل۔ ہانسبرگ میں ایک ہوٹل کے ملازم نے اس وقت نوجوان سردار کا پروانہ راہداری دیکھا جس وقت
وہ غسل خانہ میں تھا۔ وہ تمہارا پروانہ راہداری تھا!

شاہزادی۔ لغو!! اگر یہ صحیح ہے تو انہوں نے وہیں مجھے کیوں نہ گرفتار کر لیا؟

جنرل۔ جب ہوٹل کا ملازم پولیس لے کر واپس آیا تو نوجوان فرار ہو چکا تھا اور تم مع اپنے پاسپورٹ کے موجود
تھیں۔

شاہزادی۔ فرامرز! تم ان آدمیوں کو باہر بھج دو، میں اس معاملہ میں تم سے تنہا گفتگو کرنا چاہتی ہوں!
جنرل۔ (خوف سے اٹھ کر) نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے یہ گستاخی ممکن نہیں۔

کسی طرح ممکن نہیں! شاہی خاندان کی ناموس کسی مرد سے تنہائی میں گفتگو کرے! اے! اے! کیا کبھی نہیں ہوا، خواہ وہ مرد اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔

شہزادی۔ لیکن تم بھول گئے اس قانون میں ایک استثناء بھی ہے۔ شہزادیاں بچوں سے تنہائی میں بلا تخصیص جنسی گفتگو کر سکتی ہیں (نگاہوں میں ڈال کر) فرامرز! ادھر دیکھو! تمہیں میری دادی نے کھلایا ہے میرے دادا نے تمہیں ”بچہ“ کہہ کر نکارا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ شاہی خطابات ہمیشہ کے لئے ولایت ہوتے ہیں تاوقتیکہ وہ خود بادشاہ کے حکم سے منسوخ نہ کر دئے جائیں۔ اس طرح تم عرم شاہی کے قانون سے مستثنیٰ ہو۔ یوں بھی میرے نزدیک تمہاری حقیقت ایک بچے سے زیادہ نہیں۔ بہر حال میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ تم مجھ سے علیحدگی میں گفتگو کرو۔ اسن رہے ہو! یہ میرا حکم ہے! سات سو سال سے تمہارے خاندان کے کسی فرد نے شاہی خاندان کی عدول حکمی نہیں کی، کیا تمہیں اس کی جرأت ہے؟

جنرل۔ (گھبرا کر) ہاں حکم نہ ماننے کے لئے بھی ایک تاویل ہو سکتی ہے وہ یہ کہ بیجان آدمی کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا (فوراً جیب سے پستول نکال کر اپنی کپٹی کے پاس لے جاتا ہے) شہباز۔ (پھرتی سے پستول چھین کر) خدا کے لئے! جنرل صاحب، یہ کیا کر رہے ہو؟ جنرل۔ (غصہ سے پستول واپس لینے کے لئے شہباز کی طرف جھپٹ کر) نمک حرام پاچی! پستول چھوڑ! میری خاندانی عزت پر حریف آرہا ہے۔

شہباز۔ (شہزادی کی طرف پستول بڑھاتے ہوئے) جلدی لو، ورنہ یہ گیا! جنرل مجھ سے کہیں زیادہ پہلوان ہی! شہزادی۔ (پستول اٹھینے ہوئے) ہاں! اب ٹھیک ہے، تم سب سوائے جنرل صاحب کے ایک سکینڈ کے اندر کمرہ خالی کر دو! فوراً!! فوراً!! بجلی کی طرح!

(ان الفاظ کے ساتھ وہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کی طرف پستول کے دو تین فائر کرتی ہے۔ سپاہی بدحواسی سے کمرہ چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اس کے بعد وہ شہباز کی طرف مڑتی ہے۔ جسے فرامرز نے اس دوران میں فرش پر گرا دیا ہے)

شہزادی۔ تم بھی! میں تم سے کہہ رہی ہوں (وہ شہباز کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے۔ شہباز اٹھ کر خوف سے اوکی صورت دیکھتا ہے)۔۔۔۔۔ ”چلو!“ (شہباز دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور کمرے باہر پہنچ کر بھاگتے بھاگتے شہزادی سے مخاطب ہوتا ہے) ”اور فریاد کرنا۔“ ”جاں نثار!“ ”الغلاب زندہ باد!!“

شہزادی — (بگڑتے ہوئے) حکومت! — حکم کی تعمیل کرو! (یہ لکڑوہ یکے بعد دیگرے دو فیرو اور دروازہ کی طرف کرتی ہے)

جنرل — (شہزادی کی طرف بڑھتے ہوئے) شہزادی جہاں پناہ!

شہزادی — خبردار! ایک قدم نہ بڑھنے پائے، ابھی ایک گولی باقی ہے، تم نے پستول چھیننے کا ارادہ کیا اور میں (یہ لکڑوہ پستول کا رخ اپنی کنپٹی کی طرف پھیر دیتی ہے)

جنرل — (نیچھے ہٹ کر اور اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر) خدا کے لئے شہزادی ایسا نہ کرو! اسے رکھو! میں ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہوں — خدا کی قسم ہر حکم کی تعمیل کے لئے!! صرف تم پستول رکھ دو اور خود کشی کا ارادہ نہ کرو!!

شہزادی — (پستول کو میز پر پھینکتے ہوئے) لو! اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمھارے حواس درست ہو چکے ہیں!

جنرل — (اپنی آنکھوں پر ہاتھ ہٹاتے ہوئے) خداوند! تیرا شکر ہے!

شہزادی — (نرم لہجہ میں) فرامرز! تم مجھے شہزادی سمجھتے ہو، اس سے زیادہ کچھ اور تو نہیں سمجھتے؟

جنرل — (دھنوں کے بل کھڑے ہو کر) تمھیں! تمھیں! خدا جھوٹ نہ بولائے، تم میرے آقا کی نشانی ہو

اگر دنیا میں میرے لئے کسی قوت یا اقتدار کی زندہ روشنی باقی ہے تو وہ صرف تمھاری ذات میں ہے۔ میرا ہر کسی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکتا مگر تمھارے لئے میں اسے نثار کرنا اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ (یہ لکڑوہ فرط عقیدت سے اس کا ہاتھ چوم لیتا ہے)

شہزادی — (بدمزگی سے) بت پرست! مشرک!! فرامرز مجھے کب یقین آئے گا اور کس وقت تیری آنکھیں کھلیں گی کہ ہمارا اقتدار اور ہماری شان و شکوہ تجھ جیسی چند غلامانہ دہنتوں کا ایک خیالی و اہمہ تھا۔

(وہ لا پرواہی سے فرامرز کی کرسی کھینچ کر اُس پر بیٹھ جاتی ہے۔ فرامرز بدستور کھڑا رہتا ہے)

”ہاں تو اب تم بتاؤ کہ میں تمھارے حکم کی تعمیل کروں یا تم میرے حکم کی تعمیل کرو گے؟“

جنرل — (دماغی الجھنوں سے پریشان ہو کر اُس زخمی ہرن کی طرح جسے ہر طرف شکاری ہی شکاری نظر آتے ہوں۔ با یوسانہ طور پر شہزادی کو ٹکٹے لگتا ہے)

شہزادی — بتاؤ! فوراً بتاؤ!!

جنرل — (اظہار کرب کے ساتھ) خداوند! یہ کیا تماشہ ہے؟ ایک وقت میں چھ حکومتوں کے چھ مستشار

احکام اور تعمیل کرنے کے لئے تنہا میں !!! اس حال میں کہ حاکموں میں سے ایک بھی انسانیت کی صفت سے متصف نہیں !
 ایک گورنمنٹ بیرونی مخالفین سے صلح کرنے کا حکم صادر کرتی ہے، دوسری بالکل اس کے برخلاف جو پس گھنٹے میں ملک کو ان سے خالی کرالنا چاہتی ہے ! ایک کہتی ہے کہ سرمایہ داروں کو اضافی ٹیکس وصول کر کے معاف کر دو، دوسری کہتی ہے کہ ان کے بچے بچے کو گولی سے اڑا دو !
 وزیراعظم صاحب حکم نافذ کرتے ہیں کہ فلاں فلاں مجلس ملی میں شریک ہو کر اعلان کرو کہ اخترا کی حکومت کسی نئی سلطنت یا ریاست کا الجاق کرنا نہیں چاہتی بلکہ روئے زمین پر آزادی کا صورت پھونکنے کے لئے وجود پذیر ہوئی ہے۔ کابینہ اس حکم کو منسوخ کرتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ وہ مجلس خلافت قانون ہے !!

شہزادی — انھیں مرنے دو! میں کبھی ان کی بک بک پر توجہ نہیں کرتی۔
 جنرل — شہزادی جہان پناہ کے اس اظہار خیال پر مجھے بید مسرت ہے۔ یورپ کو آپ کی گرانقدر رائے سے مستفید ہونا چاہئے۔ !!

شہزادی — ہاں، لیکن فرامرز تم جانتے ہو کہ تمھاری دلی تمنا — یعنی امراء عمارہ کی کھوئی ہوئی ریاست اور اس کے اقتدار کو از سر نو قائم کرنے کی امید — اب بے فائدہ اور بیکار ہے۔
 جنرل — شہزادی صاحبہ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ ان لفاظ کا آپ کی زبان سے ادا ہونا بھی میرے نزدیک ”غداری“ ہے۔ (وہ انتہائی رنج و ملال سے لڑکھڑاتے ہوئے شہباز کی کرسی پر بیٹھ کر سر پکڑ لیتا ہے)

شہزادی — خود کو دھوکہ نہ دو فرامرز! ہمارے خاندان میں سے اب کسی کے لئے از سر نو ریاست عمارہ کی گدی پر بیٹھنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔
 (وہ کرسی سے اٹھ کر زور زور سے بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے)
 ”ہم اس درجہ پامال ہو چکے ہیں، اتنے کمزور ہو گئے ہیں، اس حد تک افسانہ ماضی بن چکے ہیں اور اس قدر ہمارے ظلم و ستم نے ہم سے انتقام لیا ہے کہ اب کوئی امید ہمارے ملعون اقتدار کے بحال ہونے کی باقی نہیں ہے۔“

جنرل — شہزادی! تم کفر و الحاد ایک رہی ہو!
 شہزادی — دنیا کی تمام ابھم صداقتیں اول ”کفر“ ہی کی صورت میں بے نقاب ہوتی ہیں — تمام بادشاہوں

کی متفقہ قوتیں اور متحدہ فوجیں بھی اب میرے باپ کے تخت کو واپس نہیں دلا سکتیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو تم شاید یہ سب سے پہلے شخص ہوتے جو اس کے لئے جہاد کرتے۔ کیوں؟ ۔ ۔ ۔ کیا تم نہیں کرتے؟

جنرل — اسے خدا بہتر جانتا ہے کہ میں کرتا۔

شاہزادی — یقیناً کرتے — میرا ایمان ہے کہ تم ضرور غریبوں پر از سر نو عذاب نازل کرتے اور رعایا کو انھیں شرمناک جیل خانوں میں بھرنے کی انتہائی کوشش کرتے اور اسے اپنی وفاداری کا انتہائی نین کارنامہ سمجھتے۔ اگر تمھارا بس چلتا تو آزادی کے نورانی آفتاب کو ضرور انسانی خون کے اسی بحرے پایا میں پھر غرق کر دیتے جس سے بمشکل تمام اس کی شمعیں ابھر سکی ہیں — یہ تمام کس لئے ہوتا؟ — اس غرض کے لئے کہ ان جملہ خوزریوں اور سفالکیوں کے قابل نفرت ہنگاموں کے درمیان تمھیں ایک خود مختار نواب کا دربار نظر آ رہا ہے جس میں جنرل کی وردی پہنے ہوئے تم ایک طرف غلاموں کی طرح کھڑے ہوئے ہو۔ تمھارے سپرد کوئی خاص کام نہیں ہے۔ کاہلی اور سستی نے تمھیں بیکار محض بنا دیا ہے، دن رات تمھیں جامیاں پر جامیاں آتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ ایک روز قبر تمھاری طرح جمائی لے کر اپنا خوفناک منہ کھولتی ہے اور تمھیں ہڑپ کر جاتی ہے! —

یہ ہے وہ زندگی جس کے لئے تم ہزار ہا مخلوق خدا کے حقوق غصب کرتے ہو، لاکھوں محصوروں کی بددعائیں لیتے ہو! — (حقارت سے) کیا زندگی ہے؟!

جنرل — شاہزادی تمھارے دباغ میں ضرور کوئی خرابی آگئی ہے مجھے اب ذرا شبہ نہیں رہا —

خدا کی پناہ! دربار شاہی کے متعلق اس قدر اہانت آمیز اور باغیانہ خیالات!!

میں نے دربار میں کبھی جامیاں نہیں لیں کتے اور فرض ناشناس سپاہی وہاں جامیاں لیا کرتے تھے؛ لیکن انھیں کا اس میں کون سا قصور تھا؟ کتے جامیاں لیا ہی کرتے ہیں۔ اُن میں نہ ذہانت و فطانت ہوتی ہے، نہ خودداری اور وقار کا مادہ ہوتا ہے، نہ وہ فرض شناس ہوتے ہیں نہ حق نمک ادا کرنا جانتے ہیں!

شاہزادی — آہ! بھولے فزاعز تمھیں دربار میں اس قدر شرکت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا کہ تم اس سے اکتا جاتے

تم زیادہ تر فوج کی نگہداشت پر باہر رہتے تھے اور جب کبھی گھر واپس آتے تمھیں دوسرا حکم تیار ملتا۔ تمھاری مسرت مجھے اور میرے والدین کو چمکیلے اور گرا بہا لباس میں نمکنت کے ساتھ چلتے پھرتے ہوئے دیکھ لینا تھا، اور بس۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

جنرل — تو کیا تم مجھے اس پر ملامت کر رہی ہو؟

شاہزادی — نہیں۔ تم اسی میں خوش تھے۔ تمہارے لئے یہی کافی تھا۔ لیکن تم میرے متعلق تو خیال کرو۔ جو

اس تمنا کو اپنے دل میں پرورش کیا کرتی تھی کہ تم نظر اٹھا کر دیکھو، عام آدمیوں کی طرح ہنس کر بات چیت کرو۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں فرشتہ نہ تھی بلکہ عام کنواری لڑکیوں کی طرح ایک لڑکی تھی، تمہارا یہ طرز عمل اچھا خاصہ میرے ساتھ ظلم تھا۔ اس کے بجائے اگر تم میری جگہ ایک موم کی گڑیا یا سونے کا بت رکھ کر اپنے گھر میں پرستش کر لیا کرتے تو بہتر تھا۔ اسے احساس تو نہ ہوتا۔ لیکن مجھے — تمہیں کیا معلوم ہے کہ مجھے کتنا گراں گذرتا تھا، اور زندگی اس ماحول میں میرے لئے کتنی عذاب تھی؟!

— پناہ بخدا !!!

جنرل — ٹھہرو! شاہزادی ٹھہرو!! ورنہ میں اُس عمد و بیباں پر قائم نہ رہ سکوں گا جس کے لئے میں ابھی

قسم کھا چکا ہوں۔ اس وضع کی خلاف اخلاق اور حیا سوز باتیں کرنے پر بیسوں عورتوں کے کوڑے لگا چکا ہوں!

شاہزادی — ان انسانیت سوز مظالم کا تذکرہ کر کے مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہارے سینہ کو تمہارے ہی پستول کا نشانہ بنادوں!

جنرل — تمہاری فطرت ہمیشہ پست اور رکیک باتوں کی طرف مائل رہی ہے تمہاری رگوں میں امیر عمارہ کا خون نہیں ہے۔ بلکہ کسی مامانے چالاکی سے بچہ تبدیل کر لیا ہے۔ میں نے تمہارے بچپن کی اکثر روایتیں سنی ہیں۔

شاہزادی — (رقعتہ لگا کر) ہاں، مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب میں پانچ چھ برس کی تھی، والدین مجھے سرکس میں لے گئے۔ وہ میری مسرت کا اولین لمحہ تھا۔ میں نے سب سے پہلی بار آزادی کی جھلک دیکھی اور بلا قصد دوڑ کر تماشہ کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ ملازمین نے دوڑ کر مجھے گود میں اٹھالیا اور پھر لا کر اسی ”سنہرے بچے“ میں بند کر دیا جس سے میں اتفاقاً رہا ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ میں نے آزادی کا ذائقہ چکھ لیا تھا اس لئے اس کے بعد کوئی پابندی اس احساس کو میرے قلب سے نہ بھلا سکی۔

جنرل — (ہنس کر) آزادی! — کیا انٹوں اور بازیگروں میں شامل ہو کر اپنا تماشہ بنانا اور دنیا کو خود پر ہنسانا، آزادی ہے؟! — سبحان اللہ کیا آزادی ہے؟!!

شاہزادی — اپنا تماشہ بنانا تو مجھے دربار ہی میں سکھایا گیا تھا، میں اس کام کے لئے باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ تھی۔

جنرل — لیکن دربار میں تمہیں نیم برہنہ ہو کر کھڑیوں کی طرح قلابازیاں کرنا اور پہلو انڈوں کی طرح سینہ نکال کر

چلنا تو شاید نہیں سکھایا گیا تھا۔

شہزادی۔ بوقوف ہو! اگر یہ باتیں مجھے میسر ہوتیں تو پھر باہر جا کر انھیں حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں بہر صورت اپنے نفرت انگیز اور ناقابل برداشت لباس سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ اور ان سے اسی طرح انتقام لیا جاسکتا تھا کہ قلابازی اور زین کے ہنر سیکھوں۔ آہ! قلابازی!..... جنرل تمھیں کیا معلوم ہے کہ قلابازی میں کتنا لطف آتا ہے؟ کیسی آزادی حاصل ہوتی ہے؟..... میں تمھیں قلا کر کے دکھاؤں؟!

جنرل۔ ہاں! تم دکھاؤ، لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اسی وقت کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لوں گا اور سرخروئی کے ساتھ تمھارے والدین سے جنت میں جا ملوں گا۔ وہ اپنی وفاداری کے تمنے تو میرے سینے سے نہ چھین سکیں گے!

شہزادی۔ تم بالکل دیوانے ہو، قطعاً ناقابل اصلاح۔ تمھیں کسی طرح یقین نہیں آسکتا کہ ہم شاہی خاندان کے افراد بھی بالکل اسی طرح گوشت و پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں جس طرح عام مخلوق۔ اور دربار کے وقت تخت شاہی پر ایک بادشاہ کے سینے میں بھی اسی طرح دل دھڑکتا رہتا ہے جس طرح ایک عام آدمی کے سینے میں۔ میں اب تم سے دلائل کے ساتھ گفتگو نہ کروں گی بلکہ اپنی قوت استعمال کروں گی، میرے ایک ادنیٰ اشارے پر تمھارے ماتحت تم سے پھر جائیں گے۔ اسی وقت ان میں سے نصف کے قریب تمھیں سلام کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور تم بھی اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پاتے کہ انھیں سزا دے سکو بلکہ تمھیں یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ان کا گستاخانہ طرز عمل تمھاری نگاہ ہی میں نہیں ہے۔

جنرل۔ اگر یہ واقعہ ہے تو کم از کم تمھیں اس پر مجھے طنز کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تمھیں تو خود شرم آنی چاہئے۔ شہزادی۔ طنز! (غصہ سے) میں طنز کرتی ہوں! ایک معمولی جنرل پر طنز!..... شاید تم اپنی ہستی کو بھول رہے ہو فرامرز!!

جنرل۔ (مودبانہ گردن جھکا کر) خدا کا شکر ہے! کم از کم اس وقت شہزادی کے لب و لہجہ میں اسی نمکنت وقار کی جھلک ہے جو میرے آقا کے شاہی خاندان میں ہونی چاہئے!

شہزادی۔ فرامرز۔ آہ فرامرز!! تیری حالت بالکل ناقابل علاج ہے اس لئے کہ غلامی کے جراثیم تیری رگ دیے میں سرایت کر چکے ہیں، انہوں نے مجھے بے حس بنا دیا ہے۔ ایسے سخت الفاظ سن کر مجھے حیرت ہے کہ تیری انسانی حمیت میں ذرا حرارت پیدا نہ ہوئی، اور میرے منہ پر تھوکنے کے بجائے تو میری تعریف کر رہا ہے!

جنرل — (خوف کے کانپ کر) خدا نہ کرے مجھ سے یہ الحاد سرزد ہو!
شاہزادی — اچھا جو کچھ تمہیں میرا غلام بننا بخوشی گوارا ہے اس لئے تم میرے احکام بھی سن لو! میں اپنے شاہی خاندان یا خونی تخت و تاج کو از سر نو بحال کرانے کے لئے نہیں آئی ہوں بلکہ تم سے ”انقلاب“ کی خدمت کرانا چاہتی ہوں۔

جنرل — شاہزادی میں بیوقوف بھی لیکن اتنی عقل مجھ میں ضرور ہے کہ انقلابی جماعت کی جو ہمارے ملک کے لئے ایک لعنت بن گئی ہے سختی سے مخالفت کروں۔ مجھے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ”انقلاب“ ہمیں کیا لفع پہونچائے گا؟ — دلو اتے نوجوانوں کی شررا نگیز فصیح و بلیغ تقریروں کے فریب میں آجانا نہایت آسان ہے، اُن کے سُرخ اشتہارات سے مرعوب ہو جانا بالکل ممکن ہے لیکن دیکھنا یہ ہے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی انہوں نے کیا خدمت کی ہے؟ اور آزادی کو عملی جامہ پہنانے میں انہوں نے کس بلند اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے؟ کیا وہ پہلے کی طرح لوگوں کو پھانسیوں پر نہیں لٹکا رہے ہیں؟ گولیوں کا نشانہ نہیں بنا رہے ہیں؟ اور جیل خانوں کو اسی قدر (بلکہ شاید اس سے کم) قیدیوں سے نہیں بھر رہے ہیں جس قدر شاہی زمانے میں بھرے جاتے تھے؟ کیا تمہارے خیال میں صداقت اور راستی کو انہوں نے اپنا اصول بنالیا ہے؟ ہرگز نہیں! یقیناً نہیں! بلکہ اگر سچ بات ان کے نزدیک مناسب و موزوں نہیں ہوتی تو وہ اس کے بجائے جھوٹ کی تبلیغ کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور اس حد تک کہ سچ بولنے کو جرم قرار دیدیا جاتا ہے۔

شاہزادی — بیشک وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کرنا چاہئے؟
جنرل — (حیرت سے منہ کھول کر) کیوں نہ کرنا چاہئے؟! خدا کی پناہ اس الحاد کا کیا جواب ہے؟
شاہزادی — بیشک انہیں کیوں نہ سچ بولنے کو جرم بنا دینا چاہئے، انہیں کا کیا قصور ہے جب ہم خود پہلے سے ایسا کرتے چلے آئے ہیں! تم خود اسی پر عمل پیرا رہے ہو! کیا تم نے ہزار ہا عورتوں کے اس بات پر کوڑے نہیں لگائے کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتی تھیں؟
جنرل — اشتراکی لٹریچر پڑھانا! بغاوت کا سبق دینا! تعلیم ہے؟!

شاہزادی — تو بہ! خدا جانے تمہارا دماغ کس کوڑے کی مٹی سے بنا ہے! بلا اشتراکی لٹریچر پڑھے ہوئے اور بلا ”کارل مارکس“ کا سبق حاصل کئے ہوئے ”دین“ و ”دنیا“ کی حقیقت سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟ — تم بلا دلیل کیوں تاویلیں کر رہے ہو؟ اپنے ظلم اور درندگی کا اعتراف ہی کیوں نہیں کر لیتے کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ مین بحیثیت عورت ہونے کے عورتوں کے کوڑے لگانے کو مردوں سے زیادہ اہمیت

دیتی ہوں؟

جنرل — یس شاہزادی کے سوال کو مطلق نہیں سمجھ سکا۔ میرے خیال میں تو آپ اپنے بیان کی خود تردید کر رہی ہیں۔
شاہزادی — لغو! — میں یہ کہتی ہوں کہ اگر پہلے خود اپنے ملک کا انتظام نہیں کر سکتی تو پھر کسی دوسرے
کو ان کا انتظام کرنا چاہئے۔ اگر وہ بلا کسی بہودگی اور بے وقوفی کے خود پر حکومت نہیں کر سکتے تو
پھر کسی اور شخص کو انھیں یہ قوت بنانا چاہئے اور انھیں زبردستی شور و شر سے محفوظ رکھنا چاہئے۔
... غرض کوئی طاقتور اور قابل بھروسہ جماعت ہمیشہ برسر اقتدار رہنی چاہئے میری رائے صرف اسی
جماعت کی موافقت میں ہے جس کے اصولوں سے مجھے اتفاق ہو۔ اس میں شک نہیں
کہ ”انقلاب“ بھی خونریزی اور سفاکی میں ابھی شاہی زمانے پر ترجیح نہیں رکھتا لیکن اس کے اصول
نہایت سودمند اور انصافانہ ہیں اس لئے میں اس کی موافقت میں ہوں۔

جنرل — تمہیں خود معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو! یہ سب ”بالشویزم“ ہے حرف بحرف ”بالشویزم“
کیا تم خود شاہی خاندان کی رکن رکن ہو کر بالشویک بن گئی ہو؟
شاہزادی — ”بالشویک“ یا ”انقلابی“ مجھے وہ سب کچھ بننا گوارا ہے جو دنیا کو زندان و قفس کے بجائے
ایک تھریٹر یا سرکس بنا دے۔

جنرل — آہ! تمہیں اب بھی ”آفتاب سرکس“ بننے کی تمنا باقی ہے!
شاہزادی — ہاں! اور اس شان کے ساتھ کہ لوگ مجھے ”بالشویک شاہزادی“ کے نام سے پکارا کریں۔
کوئی قوت میری اس تمنا کے راستہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ تمہارے لئے جو احکامات جاری کئے گئے ہیں
وہ بالکل صاف اور واضح ہیں یعنی یہ کہ تم ”انقلاب پسندوں“ کی ہر ممکن مدد کرو۔

جنرل — کیا؟ انقلاب پسندوں کی مدد؟ کون سے انقلاب پسندوں کی مدد؟ آجکل تو
ہر شخص انقلاب پسند ہی ہے۔ لیکن دو شخص بھی کسی اصول متعینہ کے پابند نہیں۔ ایسے ہنگامہ پسند
لوگوں کی کیا مدد کی جاسکتی ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا بنا رہا ہے اور ہر فرد مختلف
سمت کو دوڑ رہا ہے۔

شاہزادی — میں تمہیں بتاؤں گی — صرف ”جنگ“ ایک ”عالمگیر جنگ“ ہی اس افراط و تفریط
کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

جنرل — ”جنگ!“

شاہزادی — ہاں جنگ — صرف ایک ایسی عالمگیر جنگ ہماری مختلف جماعتوں اور ہمارے تفریق

فروق کو متحد و متفق کر سکتی ہے جس میں ہم سب کے لئے یکساں خطرہ ہو اور روس کو من حیث القوم

تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہو!

جنرل — شاباش! یہ ٹھیک ہے! واقعی جنگ ہی تمام فتنہ و فساد کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے۔ لیکن پبلک کا متحد ہو جانا بھی بیکار ہے جب تک کوئی متحدہ فوج نہ ہو۔ میں اکیلا کر ہی کیا سکتا ہوں۔ میں جنرل ہوں۔ ایک برائے نام فوج کا جنرل۔ تقریریں میں نہیں کر سکتا۔ فتوحات میرے بس کی نہیں۔ ہر شخص خود مختار ہے۔ میں کہوں گا کہ مہتمنہ پر حملہ کرنا مفید ہے، میرے سپاہی کہیں گے کہ میرے پردھاوا بولنا قرین مصلحت ہے۔

(وہ پھر بالوس ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

شاہزادی — کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ میری رائے کو بھی ترجیح نہ دیں گے۔

جنرل — ہاں ممکن تھا، اگر تم بجائے عورت کے مرد ہو تیں۔

شاہزادی — اور اگر میں اس کام کے لئے ایک مناسب و موزوں نوجوان بھی فراہم کر دوں؟

جنرل — (غصہ سے بھڑک کر) میں سمجھا! غالباً وہ وہی نوجوان ہو گا جس کے ساتھ تم بھاگ گئی تھیں۔

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم اس اوباش و آوارہ شخص کو میری فوج کا جنرل بنا کر مجھے خود اس کام کرنے پر مجبور کرو۔ . . . ناممکن!!

شاہزادی — تم نے میرے ہر حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کیا ہے، نہیں، بلکہ قسم کھائی!

(وہ کرسی سے اٹھ کر اس انداز سے ٹھٹھکتی ہے گویا کوئی جنرل اپنی فوج کا معائنہ کر رہا ہے)

”مجھے معلوم ہے کہ صرف وہی شخص فوج میں بہادری کی روح پیدا کر سکتا ہے“

جنرل حماقت ہے۔ فریب ہے۔ غالباً وہ کوئی سرکس کانٹ یا بازیگر ہو گا۔ جس سے تمہیں محبت ہو گئی ہو۔

شاہزادی — میں قسمیہ کہتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے، تم باور کرو کہ میں کبھی اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔

جنرل — تو پھر وہ کون؟

شاہزادی — ہے ایک شخص! مجھے حیرت ہے کہ تم نے نہیں دیکھا حالانکہ اس وقت بھی وہ تمہاری

نگاہوں سے کچھ دور نہیں!

جنرل — (تعجب سے چاروں طرف دیکھ کر) کہاں؟ کہاں؟

شاہزادی — کھڑکی سے! ہر جہانگ گرد دیکھو!

(وہ جھپٹ کر کھڑکی کے پاس پہنچتا ہے، اس کی نگاہیں ادھر ادھر نوجوان کو ڈھونڈھتی ہیں۔ شاہزادی اپنا سموری لبانہ اتار ڈالتی ہے اور ایک نوجوان فوجی افسر کی طرح مکمل وردی پہنے ہوئے نظر آتی ہے۔)

جنرل — (باہر جھانکتے ہوئے) مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کس طرف ہے؟
شاہزادی — اس طرف! — بیوقوف ادھر دیکھ!!

جنرل — (مڑ کر) تم! تم! تم!..... تم!! خدا کی پناہ! تم واقعی "بالشوہیک شاہزادی" ہو!

طالب باغیتی

(برزڈشا)

فراست البید۔ مولفہ 'نیا زفتجوری' جس کے مطالعے سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یاد دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت و عروج و زوال، موت و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے، قیمت علاوہ محصول عمر جذبات بھاشا۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونہ پیش کر کے ان کی ان کی اسی شہرت کی ہر کدول بیتاب ہو جاتا ہے، قیمت علاوہ محصول شاعر کا انجام۔ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ قیمت ۱۰/-

نگارستان (دوسرا ایڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مصنفین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں، نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد

مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت ۱۰/- عمار گوارہ تمدن۔ (دوسرا ایڈیشن) مولانا نیاز کی وہ محکمہ آرکٹاب جس میں تاریخ اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقا تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا رہنمائی و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۱۰/- عمار

شہاب کی سرگزشت۔ حضرت نیاز کا وہ عظیم نظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اس کی تحفیل اسکی نزاکت بیان، اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے قیمت ۱۰/- عمار تذکرہ خندہ گل۔ مولفہ 'عبدالباری' اسی جسمیں ۳۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت مع محصول دو روپیہ عمار

میجر نگار

کاروبار کی موجودہ سر بازار کی اسباب

اور ان کا علاج

بلسلہ ماہ گزشتہ

(۸) یہاں تک تو اشیاء کی رسد، اور حکومتوں کی کرنسی اور فنانشل پالیسی بحث ہوتی رہی لیکن اب اخیر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء کی طلب کے متعلق بھی اظہار رائے کیا جائے۔ جس وقت بازار کی سرور بازار کی اسباب میں لوگوں کی طلب اور مال کی نکاسی میں کمی کو بھی شامل کہا جاتا ہے تو یہ خیال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جب

..... اس آبادی میں کمی نہیں بلکہ دس فیصدی اضافہ ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں اشیاء کی پیداوار ضرورت اور طلب سے زیادہ ہے۔ لیکن کاروبار کی اصطلاح میں طلب کی کمی ایک نسبتی چیز ہے۔ اس کو نسبت اشیاء کی لاگت سے دی جاتی ہے۔ اگر ایک چیز کے تیار کرنے یا خریدار تک پہنچانے میں ایک شخص کی لاگت اُس قیمت سے زیادہ ہے جو خریدار دینے کے لئے آمادہ ہے یا دے سکتا ہے تو فروخت کرنے والے کو اس کے بیچنے میں کوئی نفع نہ ہوگا اور وہ اس چیز کے بیچنے سے باز رہے گا۔ اور اگر یہی صورت زیادہ وسیع حلقہ میں پھیل جائے گی تو عام طور پر فروخت کرنے والے اپنے اشیاء کے بیچنے سے باز رہیں گے۔ جب خوردہ فروش خریداروں کو فروخت نہ کر سکیں گے تو وہ تھوک فروشوں سے خود بھی نہیں خریدیں گے۔ جب تھوک فروش خوردہ فروشوں کو نہ بیچ سکیں گے تو وہ صناعتی اور کاریگروں سے نہیں خریدیں گے۔ اس طرح کاریگروں میں بے روزگاری پھیلے گی۔ اور ہر جگہ جہاں جہاں مزدور، زمین و مکان کے مالک اور سرمایہ دار نظر آتے ہیں اُن سب کی اجرت و منافع میں کمی اور بے روزگاری پیدا ہوگی پھر چونکہ یہی اجرت و منافع پانے والے اپنی اپنی جگہ پر اشیاء کے خریدار بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے معاملہ کے سمجھنے میں ایک عجیب پیچ در پیچ کھتی پڑ جاتی ہے جس کا سلجھانا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جس طرح اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا اسی طرح

کہنا کہ خریدار پہلے پیدا ہوا یا بیچنے والا بہت مشکل ہے۔ چونکہ عام طور پر ہر خریدار کسی نہ کسی شکل میں اپنی اشیاء یا خدمات بیچ کر یا سود و کرایہ ادا کر کے..... آمدنی حاصل کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ خود فروخت کرنے والا بھی ہوتا ہے اس لیے اشیاء کی قیمتیں ان کی اجرت پر منحصر ہیں اور ان کی اجرت اشیاء کی قیمت پر۔ اگر اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہیں تو ان کی اجرت زیادہ ہوگی۔ اگر ان کی اجرت زیادہ ہوگی تو اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہوں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں پہلے زیادہ کی جائیں یا ان کی اجرت پہلے زیادہ کی جائے۔ نتیجہ دونوں کا یکساں ہوگا۔ چونکہ سب سے بڑا گروہ خریداروں کا مزدور پیشہ طبقہ ہے اور یہ مفلس و بے روزگار ہے اس لئے خریدار من حیث الجماعت قیمت بڑھانے سے مجبور ہے۔ اب ذمہ داری سرمایہ داروں پر آتی ہے کہ یہ کیوں اجرت بڑھا کر مالگوں کو روزگار سے لگا کر، اپنی اشیاء کے خریدار پیدا نہیں کرتے؟ دنیا کی آبادی بڑھ گئی ہے اور لوگوں میں بے روزگاری ترقی پر ہے اگر یہ سب لوگ جیل سے لگ جائیں اور ان کی اجرتیں بڑھادی جائیں تو مال کی نکاسی کی ایک محدود طلب پیدا ہو سکتی ہے پھر سوال یہ ہے کہ دنیا کے سرمایہ دار اس طلب کو کیوں پیدا نہیں کرتے؟

اس سوال کا جواب علم المعیشت کے چند نہایت اہم اور مشکل مسائل کے سمجھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں تقسیم دولت، تقسیم تجارت، طریق لین دین، طرز حکومت، مختلف جگہ کے رائج الوقت سکے، شرح مبادلہ، ذرائع و وسائل آمد و رفت، طریقہ تنظیم صنعت و زراعت سے... کا حقہ آگاہی کی ضرورت ہے۔ یہاں مختصراً یہ کہا جاتا ہے کہ وسائل آمد و رفت و خبر رسائی کی ترقی کی وجہ سے کوئی ملک بالذات مستغنی نہیں ہا، بلکہ وہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ ضروریات کے لئے غیر ملکوں کا محتاج ہو گیا ہے اور دنیا کی کثیر التعداد اشیاء برابر نہایت حقیر نفع کی اُمید میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونے لگتی ہیں۔ لیکن جہاں تک مستقل سرمایہ کے منتقل کرنے کا سوال ہے اس میں سخت مقامی بندشیں ہیں۔ اور آبادی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا نہ صرف دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں بین الاقوامی اسباب سے متعین ہوتی ہیں لیکن لاگت صرف قومی اسباب سے۔ اگر کسی ملک میں آبادی زیادہ اور زمین کم ہے تو وہاں لگان و کرایہ زیادہ ہوگا، اسی طرح اصل کم اور آبادی زیادہ ہے تو شرح سود زیادہ ہوگی اگر ہنرمند مزدور، ہشیار تاجر اور آجر کم ہیں تو ان کی اجرت و منافع زیادہ ہوگا۔ گو اس میں شک نہیں کہ معمولی مزدور کی اجرت کم ہوگی۔ لیکن اگر یہ معمولی مزدور کمزور، دکھیا اور بے عقل ہے تو یہ کم مزدوری بھی بعض وقت گراں گزرے گی حکومت اگر نااہل ہے یا بددیانت ہے تو اس کی وجہ سے تجارت پر بڑا اثر ہوگا بصورت مجموعی لاگت زیادہ بیٹھے گی۔ لیکن اس کے برخلاف اگر دوسرے ملک میں آبادی کم ہے لیکن سرمایہ زیادہ، تعلیم وافر، اور آبادی مستعد، مستقل مزاج، متحمل و مضبوط سابقہ پسند، مشینری کی کثرت، حکومت ہمدرد و قابل، تو سود، منافع لگان محصول کا نرخ کم ہوگا۔ مزدوری بھی بصورت مجموعی کم ہوگی اور لاگت بھی اسی تناسب سے گھٹی ہوئی ہوگی۔

بین الاقوامی منڈیوں میں دونوں ملکوں کی اشیاء کی قیمتیں بیان کی جائیں گی اور جس ملک کی لاگت کم ہوگی وہ کم قیمت پر بیچنے کو آمادہ ہوگا اور جس کی لاگت زیادہ ہوگی وہ لاگت سے کم کسی صورت میں نہ اترے گا۔ الا اُس صورت میں کہ حکومت کسی پالیسی اور امداد کی بنا پر وہ اپنی اشیاء کو لاگت سے کم داموں پر بھی دینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ زیادہ لاگت والے کارخانوں اور ملکوں کا اسباب اُن کے گوداموں میں بھرا رکھا رہتا ہے اور کم لاگت والے ملکوں و کارخانوں کا مال ہر بازار میں خوب بکتا ہے۔ جب اسٹوروں میں اسٹاک زیادہ رہتا ہے یا نقصان پر بیجا جاتا ہے تو اور مال پیدا نہیں کرایا جاتا اور خزانے بند ہو جاتے ہیں اور جب مال پیدا نہیں کرایا جاتا تو بے روزگاری اور افلاس بڑھتا ہے اور اشیاء کی مانگ کم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر زیادہ لاگت اور کم لاگت والے سب ہی کارخانوں اور ملکوں پر کم و بیش پڑتا ہے۔ بے روزگاری ہر جگہ ترقی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ مارکٹ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کی لاگت بہت کم ہوتی ہے۔ ملکوں کی لاگت کے اور گہرے اسباب کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں اور کچھ غیر قدرتی۔ لیکن سائنس کی روز افزوں ترقی نے قدرتی اسباب کو نسبتاً بے اثر کر دیا ہے۔ لہذا اب بڑی حد تک اسباب سماجی اور سیاسی رہ جاتے ہیں۔ آبادی جاہل ہے تو کیوں ہے۔ آبادی تنگ خیال و قدامت پرست ہے تو کیوں ہے، آبادی محکوم ہے تو کیوں ہے، آبادی کے پاس سرمایہ زیادہ نہیں کیوں ہے۔ یہ سوال رہ جاتے ہیں۔ اب اگر آبادی و سرمایہ بھی اشیاء کی طرح آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتیں اور افراد آزادی سے ایک دوسرے کے ساتھ میل جول اور رسم و رشتہ پیدا کر سکتے۔۔۔ تو جاہل و تعلیم یافتہ، بے وقوف و ہوشیار، کفایت شعار و غیر کفایت شعار سرمایہ دار و غیر سرمایہ دار میں ہر ملک میں۔۔۔ یکساں تناسب قائم ہو جاتا۔ لیکن حکومتوں کے قیام و مقامی و نسلی و لسانی و مذہبی تخیلات کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخصوص زمین کے حصے مخصوص قسم کی آبادی کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی لاگت اُن کے ملک کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اور ملکی حکومتیں اپنے اغراض و مفاد کی تمنا میں دوسرے ملکوں کے اغراض و مفاد کی پروا نہیں کرتیں۔ یہ صورت حال اور حکومت کا تخیل اس زمانے کے لئے تو موزوں تھا جب ملک میں بڑی بالذات زندگی بسر کرتے تھے لیکن اب جب کہ اعلیٰ پیمانہ پر اشیاء کی پیداوار نے بڑے سے بڑے ممکن رتبہ پر تجارت کو پھیلانے کے لئے قوموں کو مجبور کر دیا ہے۔ اور جس کے پھیلانے میں وہ کامیاب بھی ہو گئی ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ جو سارا جی حکومتیں ہیں ان کی حکومت کا تخیل اب تک تو یہ رہا کہ محکوم ملک کو اُن کی مصنوعات اپنی خام پیداوار کے معاوضہ میں خریدنا چاہیے اور یہ خام پیداوار اب تک محکوم ممالک کسی نہ کسی صورت سے زیادہ تر اپنے ذاتی سرمایہ و محنت کی مدد سے دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کم لاگت پر پیدا کر لیتے تھے۔ لیکن اب وہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ دوسرے ممالک اس میدان میں بھی ان سے سبقت لے گئے ہیں۔ اب ان کے

پاس سامراجی حکومت کو اس کے مال کے معاوضہ میں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہو کہ سامراجی حکومت کا سرمایہ دار یا ملکی سرمایہ دار یا کوئی اور غیر ملک کا سرمایہ دار انھیں کسی معقول جیلہ سے لگائے تو ان کی انھیں اجرت ملے اور وہ ان سرمایہ داروں کی چیزیں خریدیں۔ لیکن یہاں سرمایہ داروں کی آپس کی کشمکش اور ایک دوسرے کی طرف سے اندیشہ و بے اعتمادی رونما ہوتی ہے۔ ہر سرمایہ دار خائف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روپیہ تو میں لگاؤں۔ اور نفع اس سے دوسرا سرمایہ دار اٹھائے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ روپیہ کہاں میں لگایا جائے اب تک تو سامراجی حکومت نے اپنی تجارت کو ترقی دینے کے لئے زیادہ تر ریلوں اور نہروں میں روپیہ لگایا۔ آئندہ کس چیز میں روپیہ لگایا جائے خام پیداوار کی ترقی میں یا مصنوعات کی ترقی میں۔ مصنوعات کی ترقی میں روپیہ لگانے کے معنی یہ ہیں کہ مارا آستین اپنے خرچ سے پیدا کیا جائے۔ اور زراعت کی ترقی کا امکان اب بہت وسیع نہیں رہ گیا ہے۔ پھر صنعتی ترقی کے لئے محکوم ممالک خود خواہش کر رہے ہیں۔ ان کی خواہشیں کس طرح اور کس حد تک پامال کی جاسکتی ہے۔

(۴) اس ضمن میں قبل اس کے کوئی اور بحث کی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخری سبب بھی بیان کر دیا جائے یعنی چین و ہندوستان میں بے امنی و خانہ جنگی اور قومیت کا ارتقا تحریک سول نافرمانی، بدیلی کپڑے کے بائیکاٹ اور سودیشی چیزوں کے رواج نے ہندوستانی بنے ہوئے کپڑے اور دیگر مصنوعات کو ترقی دی اور بیرونی ممالک میں جو ہندوستان کی مانگ کی توقع میں اشیاء بنائی گئی تھیں ان کا اسٹاک بڑھا دیا۔ دوسری طرف چین کی خانہ جنگی و بے امنی نے دنیا کی مصنوعات کے لئے جو ایک بڑی منڈی تھی اس کا دروازہ بند کر دیا۔ چین و ہندوستان دنیا کی قریب قریب نصف آبادی بسائے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان ممالک کی مانگ کے کم ہونے نے کاروبار پر بہت برا اثر ڈالا۔ یہ بھر بالشو یک خطرہ اور تمام ممالک میں مزدوروں کی تنظیم بھی جو اسٹراٹک کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ دنیا کے کاروبار میں بے اطمینانی پیدا کر کے خلل انداز ہے۔

تجارت کی سردبازاری کے اسباب کا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔ اور اب ہم جستجو کریں گے کہ تجارت کو اس کی عام سطح پر لانے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ناظرین نے غور کیا ہو گا سردبازاری کے اسباب تین گروہ میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں اول وہ جو رسد سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو طلب سے متعلق ہیں اور تیسرے وہ جو مبادلہ سے متعلق ہیں۔ اس لئے تجارت اگر عام سطح پر آسکتی ہے تو وہ ان ہی تینوں اجزاء کی اصلاح سے آسکتی ہے رسد کی اصلاح کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ اسے کم کر دیا جائے اور جب رسد طلب کے مقابلہ میں کم ہوگی۔ تو قیمتوں میں اضافہ ہو گا اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آجائے گا۔ یہ صورت ایسی ہے کہ جسے دنیا نے ہمیشہ سردبازاری کے زمانہ میں اختیار کیا ہے۔ اور عملی طور پر یہ صورت حال اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ اشیاء کی ارزانی

کے زمانہ میں ایسی دوکانیں و کارخانہ و بنک و کارخانہ کی لاگت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور جن کے پاس اثاثہ زیادہ نہیں ہوتا کہ وہ کاروبار کی تجدید کا انتظار کر سکیں دوالیہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح پر بازار میں جس مال کی رسد ان کے یہاں سے ہوتی تھی وہ بند ہو جاتی ہے۔ اور طلب میں رسد کے مقابلہ میں نسبتاً اضافہ ہو جاتا ہے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے۔ اس طریقہ کو قدرتی ترتیب جدید کا طریقہ کہتے ہیں۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کو سخت نقصان اور تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے اور اس کے علاوہ ترقی کا وہ اصول کہ دولت کا اضافہ برابر جاری رہے اور قدم آگے بڑھے پیچھے نہ ہٹنے پائے فوت ہو جاتا ہے۔ جب تک دنیا میں نیم کرسی، نیم برہنہ، اور خانہ بدوش لوگ ہیں اس قسم کی قدرتی ترتیب جدید کو انسان کے سماجی انصاف کے تخیل کو گوارا نہ کریں گے۔ پھر اس میں ذاتی و ملکی مہابقت و احریصانہ مقابلہ کا بھی سوال آ جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ سردبازاری کا ازالہ کمی رسد سے ہو گا۔ لیکن ہر شخص و ہر ملک کہتا ہے کہ رسد کی یہ کمی میرے یہاں کیوں ہو اور اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا بار دوسرے پر ڈال دے اور اس سے تمام پیچیدگیاں مبادلہ کی پیدا ہوتی ہیں۔ مبادلہ کی کامیابی کے لئے ہر ملک اپنے سونے کے خزانوں کو جن پر تجارت کا دار و مدار ہے محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسرے ملک کا سونا اپنے ملک میں کھینچ کر اپنی قوت کو مضبوط اور اپنے حریف کی قوت کو کمزور کر دے۔ یہ کہیں شرح مبادلہ کو اپنے ملک کے خلاف کر کے کیا جاتا ہے کہیں شرح بنک بڑھا کر۔ کہیں سونے کی نقل و حرکت پر پابندی عاید کر کے، کہیں دیگر ملک سے قرض لے کر۔ کہیں بجٹ کے اخراجات میں کمی اور محاصل میں زیادتی کر کے کہیں امتناعی محاصل عاید کر کے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی جاری رکھی جاتی ہے کہ جس قدر لاگت کم کی جاسکے گی جائے۔ اور بعض وقت بیرون ملک بھیجنے والے مال کی قیمت لاگت سے کم کر دی جاتی ہے اور اندرون ملک رہنے والے مال کی قیمت لاگت سے بہت زیادہ کر دی جاتی ہے۔ گورنمنٹ گرانٹ باڈی اور سبڈی دیتی ہے بل شرف کہ ہر ملک اپنے کاروبار کو ابھارنے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔ اور اس طرح قدرتی ترتیب جدید، انسانی کوشش سے ملتی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ صرف ملتی ہوئی ہے۔ اور آئندہ کے لئے اس میں بڑے خطرات پوشیدہ رہتے ہیں جو بعض وقت عالمگیر جنگ کی شکل میں بھی ترقی پا جاتے ہیں۔

اس لئے بہترین طریقہ تجارت کی سردبازاری کے رفع کرنے کا یہ ہے کہ بین الاقوامی سمجھوتہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ ہر طلب میں اضافہ کیا جائے۔ اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں رخنہ اندازی نہ کی جائے۔ دنیا کی زیادتی پیداوار کچھ فطرت کے مقابلہ میں، انسان کے عزم و استقلال، سعی و کاوش کی ایک عظیم الشان فتح ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس فتح کو شکست میں تبدیل کیا جائے۔ زر خیز زمین، مکان و مکان سرمایہ اور ضروریات کی تمام اشیاء ہر چیز انسان کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان کو محنت کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ انھیں سے

ہر چیز کی پیداوار میں اضافہ کرے گا۔ اور ایک چیز کی پیداوار کے اضافے سے دوسری چیز کی مانگ بڑھے گی۔ اور اس طرح صنعت و حرفت ترقی کرتی چلی جائے گی۔ ایک جماعت کا دوسری جماعت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش، ایک ملک کا دوسرے ملک کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ اگر جاری رہا تو تہذیب و تمدن کے قصر شاندار کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ لیکن مزدور و سرمایہ دار، محکوم ملک و سامراجی ملک اور ایک سرمایہ دار اور دوسرے سرمایہ دار، ایک سامراجی ملک اور دوسرے سامراجی ملک میں اگر اتفاق، صلح و آشتی قائم ہو جائے تو دنیا کی ترقی کے کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ بڑی خوشی ہے کہ لیگ آف نیشن اور مزدوروں کی بین الاقوامی جماعتیں اس نصب العین کو دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جبکہ ہم اس دنیا کو جنت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر ادنیٰ ترین مزدور کے لئے بھی وہی عیش و آرام فراہم کر سکیں گے جو آج بڑے بڑے رؤسا کو نصیب نہیں۔ اور امرار اور روسا کی شان و شوکت و تزک و احتشام کی تو کوئی انتہا ہی نہ ہوگی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

محمد عاقل ایم۔ اے

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

چند گھنٹے فلاسفہ قدیم و حوں کے ساتھ

(اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اس کو ملاحظہ فرمائیں)

مادین کا مذہب

(وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون ہے)

حرکت کے کرشمے

(اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں) تینوں ایک ہی جلد میں مختصراً ۲۰۰ صفحات پر علحدہ علحدہ نہیں لکھیں قیمت ۱۰۰۰ روپے
پیشہ نگار

شہنشاہ کا قطرہ گوہر

(سلسلہ ماضی)

ملکہ ناہید (نسرین کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) ”یہ کیا چیز ہے میری سرگرائی کیوں کم ہوتی جا رہی ہے، میرے دماغ کا وزن کیوں ہلکا ہو رہا ہے، میں اپنے آپ کو کیوں سبک محسوس کر رہی ہوں، میرا جسم کیوں آپ ہی آپ مائل پر داز ہے، میرے اعضا کیوں ڈھیلے ہوتے جاتے ہیں — نسرین، آج تیری آنکھیں... غیر معمولی حسین نظر آرہی ہیں، ہائیں یہ تیری پتلیوں میں غم کیسا ہے۔ تیری پلکیں اس وقت اس طرح تھر تھرائی ہیں جیسے باریک ریشمی جھال کو ہوا چھو کر گزر جائے مگر یہ فالوس بھی تو تھر تھرا رہے ہیں، ریشمی پردوں میں بھی خود ہی تھر تھری پائی جاتی ہے، چھت کانپ رہی ہے، ہوا بھی لرز رہی ہے، فضا پر ریشمی طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا مجھ سے اس وقت کھیل رہی ہے، مسکرا رہی ہے میں اسے چھوٹا چاہتی ہوں اور وہ ہنس کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ (پہلے زور سے تمہہ لگاتے ہوئے اور پھر انتہائی سنجیدگی سے) یہ فضا کی ہر چیز پر ہلکا سا نقاب کیوں بڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا ساری دنیا کے نقوش اسی طرح ہلکے ہوئے مٹ جائیں گے۔ یہ کوئی بیداری کا خواب ہے یا میرا وہم کوئی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ لا، اور دے، (نسرین کا منہ چومتے ہوئے) میری لہجہ نسرین یہ شیشہ مجھے دیدے، میں اس کو ختم کر کے دیکھوں گی کہ اس کیفیت کی انتہا کیا ہو سکتی ہے۔“

نسرین۔ ”نہیں ملکہ عالم اس سے زیادہ مناسب نہیں۔ اور ہاں، یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ وہ خواب کیا تھا جس نے دشمنوں کی جان کو اس قدر صدمہ پہونچایا۔“

ملکہ۔ (پیشانی پر ہلکی سی شکنیں ڈالتے ہوئے) نہیں اس وقت مجھ سے کوئی بات ایسی نہ کر جس کا جواب دینے کے لئے مجھے پوری طرح برہم ہو جانا چاہئے۔ علاوہ اس کے اب اس کا نقش یوں بھی کچھ ہلکا معلوم ہوا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کئی سال اس خواب پر گزر چکے ہیں اس وقت مجھے ہر چیز دور نظر آرہی ہے۔ یہ شمع دان، یہ گل دان، یہ دروازوں کے پردے، یہ دیواروں کے نقش و نگار، الغرض ہر چیز مجھ سے دور ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے میں اسے پکڑتی ہوں لیکن وہ میرے ہاتھ سے اس طرح نکلی جا رہی ہے جیسے مٹھی کی ریت۔ (نسرین کے ہاتھ سے شیشہ زبردستی لے لیتی ہے)

اور ایک جام خالی کرنے کے بعد۔ دفعۃً اٹھ بیٹھتی ہے۔ — نسریں یہ کیا تماشہ ہے، میں تو خشکی پر تیری ہوئی سی معلوم ہوتی ہوں، فرش پر پاؤں رکھنے کے کچھ دیر بعد پتہ چلتا ہے کہ میرے قدم کسی چیز کو چھو رہے ہیں، کیا میری جس باطل ہوئی جاتی ہے۔ لیکن کس قدر دلکش ہے جیسی ہے، کتنی پیاری بدحواسی ہے۔ یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ عقل و ہوش کوئی بڑی عمدہ چیز نہیں، اور اپنے آپ کو کھو دینا بڑی لذت ہے۔ — یہ گانے کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں، یہ سرود و رباب کون بجا رہا ہے۔ — محل سے اتنی دور کہاں جشن طرب برپا ہے۔ — اُن کو بلاؤ، یہاں قریب بلاؤ۔ — میں بھی گاؤں گی، رقص کروں گی اور ان کے سازوں پر کچھ ایسا نغمہ چھیڑوں گی، جو اس سے قبل کبھی میں نے نہیں گایا۔ —

یہ کہہ کر ملکہ ناہید لڑکھڑائی، نسریں نے مسکراتے ہوئے اُسے اپنی آغوش میں سنبھالا اور اس طرح پہلا درس محبت ختم ہو گیا۔

(۲)

صبح کا وقت ہے، اور آفتاب کی کرنیں دریاؤں کے نیلگوں ریشمی پردوں سے گزر گزر کر ملکہ ناہید کی خوابگاہ میں پھیل رہی ہیں۔

ملکہ جو رات خلافت معمول زیادہ دیر تک جاگی تھی ابھی تک ریشمی تکیوں، ریشمی چادروں اور مسہری کے ریشمی گدوں کے اندر پڑی ہوئی اس طرح بے خبر سو رہی ہے جیسے تیری تیری بنکر اُٹلنے سے قبل اپنے خانہ ابریشم میں آسودہ رہتی ہے، چہرہ کھلا ہوا ہے، بال منتشر ہیں، چادروں کے سرک جانے سے اس کے جسم کا نصف حصہ کمر تک بالکل بے حجاب نظر آ رہا ہے۔

کنیزیں جو صبح کی خدمت کے لئے مامور ہیں، ایک کونہ میں کھڑی ہوئی خاموشی سے منتظر ہیں کہ ملکہ انگڑائی لے اور وہ دوڑ کر پاس پہنچ جائیں۔

ایک — ”دیکھو اس وقت ملکہ کیسی بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے اور کس قدر تنہا ہے۔ جیسے کوئی سنگتراش ابھی ابھی اس مرمر میں بت کو بنا کر فارغ ہوا ہو، یا کوئی ساحر افسوں پھونک کر چلا گیا ہو،

دوسری — ”آہ، عورت کی تنہائی بھی ایک راز ہے، جس کو مرد نے ہمیشہ سمجھنا چاہا اور ہمیشہ غلطی کی۔“
تیسری — ”ہاں، مرد، غلطی سے سمجھتا ہے کہ عورت کی تنہائی اس کا سوگ ہے جسے وہ صرف محبت سے دور کر سکتا ہے درال حالیکہ.....

پہلی — ”دیکھو ملکہ کی گردن کیسی خوبصورت ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی دانت میں ہلکا سا رنگ شہاب ملا کر

کسی سانچہ میں ڈھال کر اور اس سانچہ کو نوڑ کر پھینک دیا۔ اور نرمی تو دیکھو جسے کیلے کا اندرونی حصہ۔
 دوسری — ”میری رائے میں ملکہ اگر مرد سے انتقام لینا ہی چاہتی ہے تو اس کی بہتر ترکیب اس نفرت کا اعلان نہیں بلکہ اس کو مبتلائے محبت ہونے کی اجازت دے کر تباہ کرنا ہے۔
 تیسری — ”ہاں، محبت کر کے جان لینا، ایک قسم کا زہر ہے جو دیر میں اثر کرتا ہے لیکن اس کی ہلاکت یقینی اور ناقابل علاج ہوتی ہے۔“

پہلی — ”دیکھو تو سہی سونے کی حالت میں ملکہ کی آنکھیں کس قدر بڑی معلوم ہوتی ہیں، اور یہ لابی گھنی پلکیں تو دیکھو جسے سیاہ ریشم کے باریک و نرم ریشے کسی نے سلیقہ سے جمائے ہوں۔“

دوسری — ”میں سچ کہتی ہوں کہ یہ طلسم کسی نہ کسی دن ضرور ٹوٹ کر رہے گا۔“

تیسری — ”اور یاد رکھو کہ اگر واقعی کبھی کسی شخص سے ملکہ محبت کرنے لگی تو رور کر دریا بہا دے گی۔“

پہلی — ”اٹ، یہ بالوں کے چھلے تو دیکھو کس طرح پیشانی اور شانہ و دوش پر آسودگی کے ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مردانہ روحیں پنہاں ہیں جو ملکہ کے جسم کے مختلف حصوں کو چوم چوم کر مت

ہو رہی ہیں۔ آہ، یہ قلب کی حرکت سے سینہ کے نشیب و فراز میں مسلسل جنبش، ایسا معلوم ہوتا ہے

گویا کسی کو چھوٹے کی دعوت دی جا رہی ہے!

دوسری — (پہلی کی طرف حیرت سے دیکھ کر) یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ہمارے دل میں تو یہ خیال کبھی نہیں آتے،

نہ ایسے جلے ہماری زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ تمہارے جذبات تو بالکل مردوں کے سے ہیں۔ اول اول

بار جب مجھ سے گفتگوئے محبت کی گئی تھی تو اس میں بھی یہی گرمی تھی، اسی قسم کی شیفٹکی تھی تمہارا مکان

کہاں ہے۔ وزیر اعظم نے تمہاری سفارش کر کے آج تمہیں ملکہ کی کنیزوں میں تو شامل کر دیا،

لیکن یہ نہ بتایا کہ اس قسم کی باتیں اگر کبھی ملکہ نے سن لیں تو آفت برپا ہو جائے گی۔“

تیسری — ”اس میں شک نہیں کہ تم سب میں بہت تندرست و توانا ہو، لیکن آخر کار ہو تو عورت ہی۔ کیا

تمہارے شہر میں عورتوں کو مرد بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔“

پہلی — ”معاف کرنا میں ابھی یہاں کی تہذیب سے پوری طرح واقف نہیں۔ ہمارے ملک میں عورتیں مردوں

ہی کے ساتھ تعلیم پاتی ہیں اس لئے وہ مردوں ہی کی طرح سوچتی ہیں، مردوں ہی کی طرح بولتی ہیں

اور مردوں کی طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔“

دوسری — ”اور مرد؟“

تیسری — ”وہ یقیناً عورتوں کی طرح ہو جاتے ہوں گے۔“

پہلی — (ہنسر) بالکل تو نہیں، لیکن ایک حد تک یہ کیفیت ضرور پیدا ہو چلی ہے اور —

دوسری — خاموش۔ وہ دیکھو ملکہ نے کروٹ لی۔ یہ دیکھ کر تینوں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور پائنٹی میں ٹپکھڑ دوسری

اور تیسری کنیز نے ملکہ کے تلوے سے ملانے شروع کئے۔ لیکن پہلی بدستور اسی طرح ملکہ کی صورت کو تنگتی رہی

— ملکہ نے انگڑائی لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور سامنے پہلی کنیز کو دیکھ کر پوچھا: "تو وہی ہے

جسے کل رات میں نے دیکھا تھا۔" وزیر نے تیری بڑی تعریف کی ہے اور میری حفاظت کے لئے مجھے

میرے پاس رہنے کا حکم دیا ہے مجھے معلوم ہے میری حفاظت کے کیا معنی ہیں۔"

کنیز — (سر جھکا کر) ملکہ عالم، ہمارے ملک میں حفاظت کے معنی صرف ایک ہی ہو کرتے ہیں۔

ملکہ — "وہ کیا"

کنیز — "آقا کے لئے اپنی جان دے دینا"

ملکہ — (خوش ہو کر) بالکل ٹھیک، لیکن صرف تمہارا جان دیدینا تو میری حفاظت نہیں۔ یوں کو مقابلہ کرنا

اور مرجانا"

کنیز — "بجا ارشاد ہوا ملکہ عالم۔ یہی میرا مقصود تھا"

ملکہ — (ہنستے ہوئے) اچھا فرض کرو اس وقت میرے سامنے ایک مرد آجائے اور مجھ سے اظہار محبت کرے

تو تم کیا کرو گی"

کنیز — "ملکہ عالم میں ہٹ جاؤں گی تاکہ وہ آپ سے تنہائی میں آزادی سے باتیں کر سکے"

ملکہ یہ سن کر ہنسی سے بیتاب ہو گئی اور دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی کہ — "ایہ بیوقوف

کیا مجھے نہیں معلوم کہ مرد کی جنس سے مجھے نفرت ہے اور کسی مرد کا مجھ سے اظہار محبت کرنا اتنا بڑا

گناہ ہے کہ قتل کے بعد بھی میں اپنے جذبہ انتقام کو آسودہ نہیں دیکھتی"

کنیز — "ملکہ عالم، مجھے اس کا علم نہ تھا۔ دست بستہ معافی چاہتی ہوں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے

صحیح فرائض کیا ہیں اور اگر خدا خواستہ کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ بد نصیب و نامراد مرد نے ملکہ سے اظہار

محبت کیا، تو پھر اس کا سینہ ہوگا اور یہ میرا بیچہ (یہ کہہ کر اس نے چمکتا ہوا بیچہ اپنی کمر سے نکالا اور

سر جھکا کر ملکہ کے سامنے کھڑی ہو گئی)۔

ملکہ — "کیا تو فنون پہگری سے واقف ہے"

کنیز — "اب ہمارے ملک میں عورت مرد سے زیادہ فنون پہگری کی ماہر ہوتی ہے"

ملکہ — "کیوں"

کنیز

”اس لئے کہ اب اس کی آنکھوں میں وہ افسوں باقی نہیں رہا جو مردوں سے تاب مقاومت چھین لیتا ہے، اور اسی منظر سے گھبرا کر میں یہاں آئی تھی۔ لیکن میں بھی کیسی بد نصیب ہوں کہ یہاں ایک ملکہ کو بھی اس لحاظ سے بالکل بے دست و پا پاتی ہوں اور یہاں بھی مجھے مردوں کے خلاف وہی حربہ استعمال کرنا ضروری ہو گیا ہے جسے اپنی نسائیت ایسی عزیز چیز کھو کر محض حالات سے مجبور ہو کر میں نے اختیار کیا تھا۔“

ہمارے یہاں اب سے قبل یہ دستور تھا کہ کوئی مرد کسی عورت سے یوں آزادانہ نہیں مل سکتا تھا اور ان دونوں جنسوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم تھی جس کا نام ”نسوانی غیرت و حیا“ تھا۔ اُس وقت عورت عبارت تھی ایک شاہانہ استغنا سے، ایک ملکوئی پاکیزگی سے، ایسے معصوم اچھوتے پن سے جو قدیم عہد رومہ یونان کی حسین دیویوں میں پایا جاتا تھا، مرد کا کام محنت کرنا تھا اور عورت کا اس محنت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ لینا۔ عورت حکمراں تھی اور مرد محکوم، عورت غالب تھی اور مرد مغلوب، لیکن یہ حکومت جسم پر نہیں، دلوں پر قائم تھی اور یہ غلبہ اعضا، ظاہری سے نہیں بلکہ روح سے متعلق تھا۔

جب تک عورت نے خود اپنی نسائیت، اپنی نزاکت اور اپنی لطافت و پاکیزگی کا احترام قائم رکھا، وہ ایک ملکہ، ایک دیوی کی طرح زندگی بسر کرتی رہی، لیکن جب اس کے نازک ہاتھوں نے پھاؤ ڈالے کر خود زمین کھودنا شروع کی جب اس نے مرد کے دوش بدوش مادی دنیا میں درندہ قوتوں کا مقابلہ خود شروع کر دیا، تو مرد اپنے اندر کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا، کیونکہ شام کے وقت عورت کا وہ تبسم جو مرد کی دن بھر کی محنت کا صلہ ہوا کرتا تھا مفقود ہونے لگا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ عورت کی طرف سے مرد بھی کھینچنے لگا اور جب عورت مرد کی طرح دنیا میں بالکل مردور ہو کر رہ گئی تو وہی اطوار و خصائل اس کو بھی اختیار کرنا پڑے جو محنت کی دنیا میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے لئے مرد کو اختیار کرنے پڑے ہیں اور آخر کار اس کشمکش نے سچی محبت و الفت کو بالکل محو کر دیا اور عورت مرد سے جدا ہو کر بالکل اسی طرح آزاد ہو گئی جیسے زمین کا ایک حصہ اس سے جدا ہو کر اب چاند کہلاتا ہے۔ لیکن چاند تو خیر جدا ہونے کے بعد بھی زمین کا طواف کر رہا ہے مگر عورت کی حالت تو اس سیارہ کی سی ہے جو فضا کی وسعت میں گم ہو رہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ پھر کبھی نظر آئے گا یا نہیں۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں بھی مرد عورت میں یہی جنگ قائم ہے تو میں کیوں آتی اے ملکہ عالم، سچ بتائے کیا واقعی یہاں کی عورت بھی محبت کرنا بھول گئی ہے اور کیا یہاں کے مرد کا بھی مستقبل ریگستان کی طرح سنسان ہے۔“

ملکہ ناہید جس کے سامنے اس وقت تک کسی کو اس موضوع پر گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی، حیرت سے کینیز کا منہ دیکھ رہی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ دیر اور وہ ایسی ہی باتیں کرتی رہے۔ — ملکہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور باقی دونوں کینیزوں کو رخصت کرنے کے بعد جب تنہائی ہو گئی، تو اس نے اس کو اپنے پاس بلایا اور بولی کہ: —

”اے حسین نووارد، ادھر آ، مجھ سے قریب ہو کر باتیں کر، تو بہت ذہین ہے، نہایت جری ہے اور اسی کے ساتھ میں دیکھتی ہوں کہ تیرے اندر کچھ ایسی عقل و فراست ہے جو ہمارے ملک میں مردوں ہی کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں تجھ ایسی عورتیں پیدا ہونے لگیں، تو میں چن چن کر ایک ایک مرد کو اپنی حکومت سے نکال دوں اور تمام نظم و نسق عورتوں ہی کے سپرد کر دوں۔ ہاں، ادھر آ، میں زیادہ نزدیک سے تیرا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں، میرے پاس بیٹھ کر گفتگو کر، تیری آواز میں ہر چند وہ نرمی اور لوح نہیں ہے جو عورت کی آواز میں ہونا چاہئے ہے لیکن اس کا وزن بھی تجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ — گو میں تجھ سے موسیقی کی خدمت نہ لے سکوں گی لیکن تیری آواز کے ذریعہ سے میں ایک شاہانہ و مردانہ حکم تو لوگوں کو دے سکوں گی۔ — اور قریب آ۔ میری خلوت میں شاہانہ آداب کی ضرورت نہیں۔ — یہاں ہم اور تم دونوں عورت ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں زیادہ بے بس ہوں اور تو بڑی حد تک آزاد۔ — پھر بتا تو میری کیا مدد کر سکتی ہے۔ — سارے ملک میں میرے حسن و جمال کی شہرت نے مردوں کو دیوانہ سا بنا رکھا ہے اور چونکہ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ آئین حکومت کے لحاظ سے مجھے کسی نہ کسی مرد کو اپنا شریک زندگی بنانا ضروری ہے، اس لیے طبقہ امرا کا ہر نوجوان اس آرزو کو اپنے دل میں لئے ہوئے ہے۔ — اور روزانہ مجلس و زرا مجھے مجبور کرتی ہے کہ جلد سے جلد کوئی انتخاب کر لوں ورنہ ملک میں بغاوت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ — پھر چونکہ اس سلسلہ میں بعض مردوں کو

میرے حکم سے سزائے قتل بھی مل چکی ہے، اس لئے میرے خلاف برہمی
 بڑھتی جا رہی ہے اور حیران ہوں کہ کیونکر اپنے دل کو اس طرف
 مائل کروں اور کس طرح اس ذلت کو برداشت کر سکوں —
 دنیا مجھے حسین سمجھتی ہے، حالانکہ میں اپنے اندر کوئی غیر معمولی بات
 نہیں پاتی۔ آئینہ دیکھتی ہوں اور گھنٹوں حیران رہتی ہوں کہ مجھ میں آخر
 وہ کون سی خصوصیت ہے جس کے لئے دنیا پاگل ہو رہی ہے —
 یقیناً یہ دیوانگی میرے لئے نہیں ہے بلکہ صرف امارت و سلطنت کے
 لئے ہے، تخت و تاج کے لئے ہے، مرد کی خود غرضی تاریخ کا نیا واقعہ
 نہیں اور اس نے جو جو مظالم عورت پر کئے ہیں وہ ایسے نہیں کہ عورت
 انھیں آسانی سے فراموش کر دے — پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کا
 انتقام نہ لیا جائے اور وہ انتقام میرے اور میری ہی سلطنت کے
 ذریعہ سے نہ ہو — آہ، مجھے جس قدر اپنی کمزوریوں کا احساس ہوتا
 جاتا ہے، میری تکلیف بڑھتی جاتی ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ
 ایک دن وہ آنے والا ہے جب مجھے ملک کے اس بڑھتے ہوئے بیجا
 کے سامنے اعتراف شکست کرنا پڑے گا، خواہ وہ اعتراف کسی ظالم
 مرد کو اپنے اوپر مسلط کر دینے کی صورت میں ہو، یا تخت و تاج
 چھوڑ کر ملک سے باہر نکل جانے کی شکل میں —

کنیز — ”ملکہ عالم، خدا نہ کرے وہ وقت آئے جب صورت حال اتنی نازک ہو مجھے سوچنے کا موقعہ دیا
 جائے، ممکن ہے میں کوئی صورت بہتر پیدا کر سکوں“
 ملکہ اسید کی جھلک پا کر بے اختیارانہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کنیز کا ہاتھ پکڑ کر اس کے چہرہ کو غور سے دیکھنے کے بعد
 دفعۃً ہٹ گئی اور بولی: —

”یہ تیری آنکھوں میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھے مسحور کرنا چاہتی
 ہے۔ دنیا ان آنکھوں کے لئے کیوں نہیں تڑپتی — کتنی خوبصورت
 آنکھیں ہیں، پتلی کتنی سیاہ ہے، پلکیں کیسی لابی اور لوکداری ہیں۔ ان
 آنکھوں سے بجلی کی رو باہر نکلتی ہوئی معلوم ہوئی ہے۔ کیا تو نے شراب

بی ہے اور اتنی کہ آنکھوں سے ابلی پڑ رہی ہے۔ میں نے بھی چند دن سے اس کا استعمال شروع کیا ہے، لیکن نہ میرے ہاتھ اتنے گرم ہوتے ہیں، نہ آنکھوں میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے ہاتھ میں میری کلائی لے کر دیکھ کتنا فرق ہے (گھبرا کر) یہ تو کانپ کیوں رہی ہے، یہ تیرے جسم پر لرزہ کیوں طاری ہے (ہنستے ہوئے) اچھا میرے ساتھ چل، آج حمام میں تیرے ہی ہاتھ سے غسل کروں گی۔“

یہ سن کر کنیز دور ہٹ گئی اور بولی کہ

”ملکہ عالم مجھ سے جو خدمت جی میں آئے نیچے لیکن حمام میں نہ لیجائیے، کیونکہ میں آداب شاہی سے بالکل باواقف ہوں، اور یوں بھی میرے ہاتھ زیادہ سخت و کڑخت ہیں جن سے ملکہ کے پھول ایسے جسم کو ضرر پہنچ جائے گا اندیشہ ہے۔“

ملکہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ

”مجھے آج جسم میں خراش ہی پیدا کرنا ہے، آج جی یہی چاہتا ہے، کیا تو میرا حکم نہ مانے گی؟“

یہ کہہ کر ملکہ حمام کی طرف جانے ہی والی تھی کہ نسرین گھبرائی ہوئی آئی اور بولی کہ ایک نہایت ہی ضروری امر میں ملکہ کا مشورہ حاصل کرنا ہے۔ ملکہ جو آج کل معمولی سی بات میں بھی گھبرا جاتی تھی۔ نسرین کی طرف مخاطب ہو گئی اور کنیز رخصت کر دی گئی، (باقی آئندہ)

نیاز

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب، اردو حصہ علاوہ حصول ۸۰ انگریزی حصہ علاوہ حصول ۸۰ ہر دو حصے مع حصول ۸۰ نیچر نگار لکھنؤ

وقت و زمان کی حقیقت

- س :- قریطو! اب کیا وقت ہے؟
- ق :- سات بجے ۲۳ منٹ آئے ہیں؟
- س :- اوہو! میرے اندازہ سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔ لیکن! یہ تو بتاؤ کہ "سات بجے تیس منٹ" کے کیا معنی ہیں؟
- ق :- اس کے معنی یہ ہیں کہ دوپہر کے بعد سات گھنٹے اور ۲۳ منٹ گزر چکے ہیں
- س :- معاف کیجئے میں ابھی نہیں سمجھا مگر مہربانی کر کے یہ بتا دیجئے کہ گھنٹے اور منٹ کیا چیز ہیں؟
- ق :- جناب یہ تقسیم اوقات کے آحاد ہیں ایک سکند وقت کی سب سے چھوٹی اکائی ہے اور ساٹھ سکند مل کر ایک منٹ اور ساٹھ منٹ مل کر ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو ایسی بات ہے جسے آپ اور ہم دونوں جانتے ہیں۔
- س :- بالکل درست ہے۔ لیکن جس چیز کا نام آپ نے "وقت" رکھا ہے وہ کیا چیز ہے۔
- ق :- یہ بتانا تو بہت دشوار ہے کہ "وقت" کیا چیز ہے۔ لیکن اس امر کا احساس کہ کچھ واقعات زمانہ ماضی میں گزر چکے ہیں، کچھ واقعات "اب" رونما ہو رہے ہیں۔ اور کچھ واقعات ایسے ہیں جن کی نسبت ہم کو زمانہ مستقبل میں پیش آنے کی توقع ہے، وقت کی تعیین کرنے کے لئے کافی ہے۔
- س :- تو کیا واقعی "وقت" کچھ اصلیت رکھتا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت ہے۔
- ق :- یقیناً! اس سے زیادہ گھلی ہوئی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ وقت ایسی ہی حقیقت رکھتا ہے جیسی ہماری اور آپ کی ہستی۔ اگر وقت معدوم ہو جائے تو اس کے ساتھ ہماری ہستیاں بھی معدوم ہو جائیں۔ ہم کو بہت سے واقعات ایسے معلوم ہیں جو زمانہ ماضی میں گزرے تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "اب" کیا ہو رہا ہے۔ اور ہم آئندہ یا مستقبل کی توقع میں جیتے ہیں
- س :- مجھے یہ بات سن کر بہت تعجب ہو رہا ہے۔ سنئے! ہم وقت کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ وہ کبھی زمانہ ماضی تھا، آئندہ زمانہ مستقبل ہوگا اور اب زمانہ حال ہے، ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مستقبل زمانہ حال کے بعد آتا ہے، اور ماضی زمانہ حال سے پیشتر گزر جاتا ہے، حالانکہ اگر ہم وقت کی نسبت یہ خیال کریں کہ وہ ہمارے ساتھ ساتھ گزرتا ہے اور اپنے

ساتھ ہمارے تجربات بھی لاتارہتا ہے، تو اس صورت میں مستقبل کو سب سے آگے ہونا چاہئے۔ لیکن اگر ہم اپنی نسبت یہ سمجھیں کہ ہم خود وقت سے گزر رہے ہیں تو ہمیں سب سے اوّل زمانہ ماضی سے گزرنا چاہئے۔ اس کے بعد مستقبل سے۔ مگر نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ماضی اس وقت تک ہرگز ماضی نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان واقعات کو نہ دیکھ لیں جن کا تعلق اس زمانہ سے ہے۔ اور یہ واقعات ہمیشہ زمانہ حال میں گزرتے ہیں۔ پس یہ امر یقینی ہے کہ ہم مستقبل سے کبھی نہیں گذریں گے۔ سہولت استدلال کے لئے یہ تصور کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ گزرتا ہے۔ اس صورت میں مستقبل سب سے آگے ہوگا اسی طرح جو واقعہ گزرنے والا ہے وہ ہم سے زیادہ قریب ہوتا جائے گا۔ جب وہ واقعہ رونما ہو رہا ہوگا تو وہ حال ہوگا اور جب وہ واقعہ ہو چکے گا تو ماضی۔ اب آپ بتائیے کہ حال کی نسبت آپ کیا سمجھتے ہیں؟

ق :- یہی کہ مثلاً ہماری گفتگو زمانہ حال سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ اور دونوں ”اب“ باتیں کر رہے ہیں۔ یعنی جسے آپ ”اب“ کہتے ہیں یہی ہے حال۔

س :- دیکھئے آپ کی زبان نے سب سے آخری لفظ ”حال“ ادا کیا ہے۔ تو کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ واقعہ اب ماضی ہو گیا ہے؟

ق :- یقیناً ماضی بن گیا ہے۔ اور بالکل اسی طرح وہ آخری لفظ جو میری زبان سے نکلتا جاتا ہے ہر لمحہ ماضی بنتا جاتا ہے۔ لیکن میں ”حال“ کا تصور زیادہ عام اور عملی معنی میں کر رہا ہوں۔

س :- اگر ہم عملی گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے الفاظ بالکل ”پنپے تلے“ ہونا چاہئیں۔ اگر آپ کسی چیز کے ”تصور عمومی“ پر بھروسہ کریں گے تو بتائیے کہ آپ حد فاصل کا خط کہاں کھینچیں گے؟

ق :- یہاں بیشک ایک مشکل پیش آتی ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ خط کہاں کھینچا جائے گا۔

س :- جب ہم اپنی قوت شعور سے کام لے کر یہ تعین کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ مستقبل کہاں ختم ہوتا ہے اور ماضی

کہاں سے شروع ہوتا ہے تو ہم کامیاب نہیں ہوتے اور اس بارہ میں کوئی خاص رائے قائم نہیں کر سکتے کہ ”حال“

کا زمانہ کب تک رہتا ہے اگر اس بات کا زیادہ گہری نظر سے تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یہ صرف ایک خط فاصل معلوم ہوتا

ہے جس میں ”عرض“ کچھ نہیں۔ اور عین جس وقت ہم پر کوئی واقعہ گزرتا ہے اس کے لمحہ بھر بعد وہ واقعہ ماضی

سے متعلق ہو جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ق :- معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاں آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔

س :- قریطو! کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل جو ان واقعات سے معمور ہے جن کا ہنوز ظہور نہیں ہوا، درحقیقت

کوئی وجود رکھتا ہے؟ یا ایک واقعہ جو ایک ہزار سال پیشتر گزر چکا ہے اب بھی بحیثیت واقعہ کوئی حقیقی وجود رکھتا ہے؟

ق :- نہیں! میرے خیال میں تو نہیں رکھتا۔

س :- اگر مستقبل اور ماضی واقعی یقینی حقیقتیں ہیں پھر ”حال“ کا وجود کہیں نہیں رہا۔ لیکن بغیر حال کے ہماری ہستی ہی غالب ہو جاتی ہے کیونکہ ہم نہ ماضی میں رہ سکتے ہیں نہ مستقبل میں اور بقول آپ کے حال ضرور ہونا چاہئے۔ لہذا تمام وقت ”حال ہی حال“ ہے کئے آپ کا کیا خیال ہے؟

ق :- میرا تو دماغ چکر اگیا۔ اور میں از روئے منطق آپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن مستقبل، حال اور ماضی ضرور ہیں

س :- اچھا تو اب آپ اس معاملہ کو دوسرے پیرایہ میں لیجئے۔ یعنی واقعات کا مقابلہ کیجئے۔ آپ وقت کی نسبت کیا جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم کو شعوری طور پر اس کا علم حاصل ہے۔ کیا اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ دماغی یا ذہنی طور پر اس کے وجود کا احساس کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے قوائے احساں قطعی ناقابل اعتبار ہیں۔ چنانچہ میں ثابت کئے دیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ اسی گھنٹہ میں ایک شخص مسمیٰ زید کسی ایسے شغل میں مصروف ہے جس میں اس کو بجد لطف حاصل ہو رہا ہے۔ مثلاً شطرنج۔ اور اسی وقت دوسرا شخص بکرنہایت اضطراب کے ساتھ کسی کام کے ہونے کا منتظر ہے جس میں دیر ہوتی جاتی ہے۔ اب ان دونوں کے پاس اپنے اپنے قوائے احساس کے سوا اور کوئی طریقہ وقت شماری کا نہیں ہے تو بتائے کہ زید کے نزدیک وہ — گھنٹہ طویل ہوگا یا قلیل؟

ق :- یقیناً قلیل ہوگا

س :- اور بکر کے نزدیک کیسا ہوگا؟

ق :- طویل!

س :- ایک ہی گھنٹہ ایک شخص کے لئے قلیل ہوگا اور دوسرے کے لئے طویل۔ یہ کیوں ہو سکتا ہے؟

ق :- بیشک وقت تو ایک ہی ہے۔ لیکن جو فرق آپ نے بیان کیا ہے وہ ان دونوں شخصوں کے حیات و محسوسات کا فرق ہے جو ذہن کی مختلف حالتوں سے اثر پذیر ہیں۔ اب میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ وقت کے متعلق ہمارے قوائے احساس ہمیشہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

س :- اچھا تو اس صورت میں وقت یا تو ایسی کوئی چیز نہیں جو ہستی انسانی سے علیحدہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو۔ باہر ہر شخص کے ساتھ وقت کی حیثیت جداگانہ ہوتی ہے اور اس صورت میں وقت لاشعے محض قرار پاتا ہے۔

ق :- میں اس وقت آپ کے دلائل کو نہ تسلیم کرتا ہوں نہ ان کی تردید کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ سلسلہ گفتگو جاری

رکھیں کیونکہ آپ کا طریقہ تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔

س :- ”اسی گھنٹہ“ سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ گھنٹہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا تھا کہ وہ وقت کی ایک ”اکائی“ ہے جس جیکہ ہمارے قوائے احساس اس قدر ناقابل اعتبار ہیں تو پھر ہم وقت کا اندازہ یا پیمائش کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ اس کا جواب غالباً یہ دیں گے کہ گھنٹہ اس حصہ وقت کو کہتے ہیں کہ گھڑی کی منٹ والی سوئی ڈائل کی ایک گردش پوری کرے۔ لیکن اگر میں اپنے ہاتھ کی انگلی سے منٹ کی سوئی کو ڈائل کا ایک پورا چکر دے دوں تو کیا یہ وقت ایک گھنٹہ ہو جائے گا؟

ق :- یقیناً نہیں! ایسا دعویٰ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

س :- گویا منٹ کی سوئی کی رفتار بالکل یکساں اور اس معیار کے مطابق ہونا چاہئے جس کی پابندی تمام گھڑیاں کرتی ہیں۔ لہذا جس چیز کو ہم وقت کہتے ہیں وہ اس طریقہ استدلال کے بموجب محض حوادث حرکاتی میں داخل ہونے والی ایک چیز ہے یا کم از کم اس کا تعلق حرکت سے ہے۔ اور ہم اس کی پیمائش حرکت اور وسعت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ یعنی ایک مادی چیز جسے منٹ کی سوئی کہتے ہیں وہ ایک مقررہ اور یکساں رفتار کے ساتھ ایک مقررہ فاصلہ طے کرتی ہے تو ہمیں وقت معلوم ہوتا ہے۔ وقت کی پیمائش یا محسوس کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہم کو معلوم ہے۔ لیکن جس طرح حرکت و وسعت زمانی وقت نہیں ہے اسی طرح وقت بھی حرکت و وسعت نہیں۔ حرکت اور وسعت دونوں قطعی مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے وقت ان دونوں متضاد چیزوں کا مرکب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ وقت (جیسا کہ ہم اس کی نسبت عموماً خیال کرتے ہیں) تجربات و واقعات انسانی سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا کیونکہ حرکت اور وسعت ایسی چیزیں نہیں جو دونوں مل کر ایک تیسری مستقل چیز پیدا کر سکیں تو گویا ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے جو ہم نے پہلے اخذ کیا تھا یعنی یہ کہ وقت کوئی چیز نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ ”حال ہی حال“ ہے۔

ق :- آپ کے جوجی میں آئے کہنے میں تو اپنی اسی رائے پر قائم ہوں جو پہلے تھی۔

س :- تحقیق و تدقیق کے لئے خواہ آپ کتنے ہی مختلف طریقے اختیار کر لیں لیکن کیا آپ یہ تسلیم نہ کریں گے کہ آخر میں وہی نتیجہ نکلتا ہے؟

ق :- ہاں منطقی لحاظ سے تو یہی بات ہے۔

س :- آپ کو جو وقت پیش آرہی ہے وہ محض اس قدر ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ خیال نہایت پختہ ہو گیا ہو کہ وقت ایک چیز ہے جو مستقل وجود رکھتی ہے۔ اور اس کے تین حصے ماضی حال اور استقبال ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا کئے جاسکتے ہیں۔ اور اسی خیال کی وجہ سے ہم ان نتائج کو منظور نہیں کرتے

جن تک ہم از روئے منطق پہنچتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان منطقی نتائج کو منظور کر لیں تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ حالات میں کوئی تغیر ہو جائے گا۔

ق۔ ب۔ قطع کلام معاف! اگر یہ نتیجہ جو آپ نے اخذ کیا ہے صحیح ہے اور جیسا کہ آپ کا منشاء ہے اس نتیجہ سے وقت لاشے محض رہ جاتا ہے، تو لازم ہوگا کہ انسان کے اندر ایک سرچشمہ شباب ابدی قائم ہو جائے۔ کیونکہ اگر وقت کوئی چیز نہیں اور جو کچھ ہے وہ ”حال ہی حال“ ہے تو پھر کوئی شخص بوڑھا نہیں ہو سکتا ہر شخص ہمیشہ جوان رہیگا۔ پھر اس بڑھاپے کی آپ کیا علت بیان کریں گے۔ یا آپ انسان کی اس حالت سے بھی انکار کر بیٹھیں گے جسے بڑھاپا کہتے ہیں؟

س۔ ب۔ میں اس سے ہرگز انکار نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا تامل کے ساتھ اس بات پر غور کریں کہ بڑھاپا کیا چیز ہے تو میں آپ کو بہت جلد بڑھاپے کی وجہ بتا دوں گا اور وہ بھی ایسے طریقے سے جو میرے استدلال کے عین مطابق ہو۔ سنو! بڑھاپا نام ہے صرف تغیر کا جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شخص کے چہرے میں جھریاں پڑ گئی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ”بڑھاپا“ آگیا۔ فرض کرو کہ ایک بست سالہ نوجوان کے بال کسی غیر فطری سبب سے سفید ہو جائیں، اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں، چلتے ہوئے اس کے قدم رک رک کر پڑتے ہیں۔ تو محض صورت دیکھ کر ہم ”بڑھاپے“ کا فتویٰ دیدیں گے۔ اگر کسی کپڑے کا رنگ اڑ جائے اور وہ گھس جائے تو ہم کہتے ہیں کہ ”پرانا“ ہو گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کیجئے کہ ایک جوہری کی دکان میں کسی انگشتی کے اندر حال ہی میں ایک بیش قیمت ہیرا جڑا گیا ہے۔ خواہ وہ ہیرا کسی زمانہ میں بلقیس ملکہ سے ملے ہو یا تو کیا آپ یہ کہہ دیں گے کہ یہ انگشتی ”بڑانی“ ہے۔ کیا آج تک کسی نے کسی ہیرے کو ”پرانا“ کہا ہے؟ نہیں۔ کیونکہ ہیرے میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا اس لئے وہ ”نیا“ ہوگا۔

ق۔ ب۔ میں نے اس بارہ میں اس طرح کبھی فکر نہیں کی۔ پھر بھی وہ ہیرا خواہ کوئی ہیرا ہو ”پرانا“ ہی کہلائے گا۔ س۔ ب۔ اچھا اب میں اس مسئلہ کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ایک دوسرا سلسلہ خیال قائم کرتا ہوں۔ ہمارے استادوں نے حروف ابجد کی ترتیب اسی طرح سکھلائی ہے کہ ہم الف سے شروع کر کے ترتیب وار یا تک سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ جب ہم حروف تہجی اپنی زبان سے بولیں گے اور یا تک پہنچیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم الف کہہ آئے ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ دونوں میں کون ”پرانا“ ہو یعنی الف یا یا۔ ظاہر ہے کہ ہم نے یا سے پہلے الف کہا تھا لیکن اس وجہ سے الف بمقابلہ یا کے پرانا نہیں ہو گیا اب اسی مثال کا اطلاق آپ اور جگہ بھی کیجئے۔ یعنی حالات طبعی کے ماتحت ایک چکنا اور صاف چہرہ، سیاہ بال اور لچکدار رفتار عموماً ایک جھڑیلوں دار چہرہ، سے پیشتر اسی ایک شخص کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وجہ سے اور کیوں مگر ہوتا ہمیشہ یوں ہی ہے۔ جب ہم بازار کی دکان سے کپڑا خریدتے ہیں تو کپڑے کی چمکدار اور خوشنما حالت پہلے اور اس کی خستہ اور بوسیدہ حالت بعد میں ہوتی ہے۔ لیکن جس کاریگر نے وہ کپڑا تیار کیا ہے اس نے اس کپڑے کی حالت رنگے جانے سے بھی قبل دیکھی تھی۔ اس وقت کپڑے کی مکروہ اور بد نما حالت پہلے تھی اور اس کی خوشنما اور رنگین حالت بعد میں ہوئی تھی۔ اس طرح گویا کپڑے کی یہ موخر الذکر حالت ”پرانی“ ہو گئی۔ اور وہ مکروہ اور بوسیدہ حالت پہلی ہوئی۔ کیا یہ بات قانون قدرت کے مطابق ہو گی کہ ایک شخص جھربلوں دار چہرہ۔ اور سفید بال لے کر پیدا ہوا اور جب اس کی دنیوی زندگی کا اختتام ہو تو اس کا چہرہ صاف روشن اور اس کے بال سیاہ ہو جائیں۔ اگر یہ حالت ہو تو جن علامات کو ہم جوانی کی علامات سمجھتے ہیں وہ بڑھاپے کی اور بڑھاپے کی علامات شباب کی نشانیاں سمجھی جائیں گی۔ لہذا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وقت یا عمر سلسلہ تغیرات کا ایک منظر ہے۔

اس مسئلہ پر زبان کے ذریعہ سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں ”آج سے قبل“ ”زمانہ ہوا“ ”حال ہی میں“ وغیرہ۔ ان سب الفاظ سے فاصلہ یا وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ وقت بہت جلدی گذرا۔ ”چشم زدن“۔ ”وقت اڑا چلا جا رہا ہے“۔ ”وقت کٹتا ہی نہیں“ وغیرہ تو ان محاورات سے ”حرکت“ کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا آپ وقت کی نسبت کوئی اور حقیقت بیان کر سکتے ہیں۔ جو حرکت و وسعت سے متعلق نہ ہو؟

ق۔ کیوں نہیں! ہم روز کہتے ہیں کہ ”بڑا کٹھن وقت ہے“ یا ”وقت اچھا گذرا“ یا ”وہ اور وقت تھی“ ان جملہ محاورات سے وقت کی حالت کا اظہار ہوتا ہے۔ پیمائش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ محض استعارے اور تشبیہات ہیں۔

س۔ اچھا تو اب اس مسئلہ پر عملی طریقہ سے غور فرمائیے۔ فرض کیجئے کہ آپ چکاگو سے نیویارک تک براہ ڈٹرائٹ سفر کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو ڈٹرائٹ میں کوئی دیر نہ ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ونڈسیر کی گھڑی کے حساب سے آپ ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ میں ونڈسیر پہنچے، حالانکہ ریل پوری رفتار سے چل رہی تھی اور فاصلہ صرف چند میل کا ہے۔ اب اپنی گھڑی کو ونڈسیر کی گھڑی کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک گھنٹہ سست ہے اور ہمیشہ اتنی ہی سست رہے گی جب تک آپ ڈٹرائٹ کے مشرق میں رہیں گے یعنی یہاں آپ بہ اندازہ ایک گھنٹہ زیادہ مہمور رہیں گے۔ اور آپ کی سالگرہ ہمیشہ ایک گھنٹہ پیشتر ہوگی۔ اس تغیر کا سبب یہ ہے کہ آپ کا جسم اس رفتار سے زیادہ تیز حرکت کرتا رہا ہے جس رفتار سے زمین اپنے محور میں گردش کرتی ہے۔ اور اس لئے وقت پورا کرتے کے لئے آپ کو ہر پندرہ درجہ طول البلد کے بعد اپنی گھڑی ایک گھنٹہ بڑھانا پڑے گی

اگر آپ بحر الکاہل میں کسی جہاز پر ہوتے اور آپ کا سفر خط استوا کے قریب جانب مشرق ہوتا۔ اور آپ جزائر فوجی کی کسی بندرگاہ میں پہنچتے اور پھر وہاں سے شنبہ کے روز بارہ بجے بذریعہ طیارہ جزائر ساموا کو جاتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ وہاں کی جنتری کی رو سے وہ دن اتوار ہے اور وقت کے لحاظ سے شام کے تین بجے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر زمین کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا جائے تو بجائے گھنٹہ کے پورا ایک دن ضائع ہوتا ہے۔ کیونکہ مسافر زمین کے مقابلہ میں ایک گردش زبان کر لیتا ہے۔

ق :- یہاں تک تو آپ نے صحیح فرمایا اور ان واقعات سے آپ کے استدلال کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اصلی بات یعنی وقت کا مسئلہ بدستور باقی رہا۔ آپ یہ بیان فرمائیں کہ ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کیونکر ضائع ہو سکتا ہے

س :- ہفتے اور مہینے محض تعدادی باتیں ہیں۔ یعنی ہفتہ دنوں کا مجموعہ اور مہینہ سال کا ایک حصہ ہے۔ سات مرتبہ زمین کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف چکر لگائیے تو ایک ہفتہ ضائع ہو جائے گا۔ اور اگر یہی عمل تیس یا اکتیس مرتبہ کیا جائے تو ایک مہینہ ضائع ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ ہماری زمین کی طرح کا ایک اور سیارہ ہے اور اس میں ہماری زمین کی طرح انسانوں کی بھی آبادی ہے۔ اور یہ سیارہ محور زمین کے اندر اندر آفتاب کے گرد زمین سے نصف مدت میں گردش کرتا ہے۔ لیکن اپنے محور پر زمین سے دو گنی رفتار کے ساتھ گھومتا ہے۔ اور جس طرح زمین کا محور اس کے محور سے زاویہ بناتا ہے اسی طرح اس سیارہ کا محور بھی وہی زاویہ بناتا ہے اور اس سیارہ میں بھی موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ صورت ممکن ہو اور میں اس سیارہ پر یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو پہنچوں اور دیکھوں کہ وہاں کے آدمی بھی ہماری طرح وقت کی پیمائش کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں گھنٹہ والی گھڑی کی سوئی اتنے عرصہ میں ڈائل کے دو چکر لگاتی ہے جتنے عرصہ میں وہ سیارہ اپنے محور کے گرد گھوم کر دن اور رات پیدا کرتا ہے۔ اگر میری گھڑی اسی طرح چلتی رہی جیسے کہ وہ زمین پر چلتی تھی اور وقت بھی بالکل صحیح دے۔ اور میں اپنی گھڑی کی حرکت کی بنا پر یوم شماری کروں تو یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو میں اس سیارہ کے فلک پر اسی مقام میں ہوں گا۔ جہاں میں نازل ہوا تھا اور اس وقت یہاں پھر موسم سرما کا وسطی زمانہ ہوگا اور بہار۔ گرما۔ خزاں اور سرما کا نصف زمانہ گزر چکا ہوگا۔ اور یہاں کے جو باشندے میرے ارد گردوں کے وہ اپنے حساب سے بمقابلہ میرے چھ ماہ بڑے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ دن یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہوگا۔ اب فرض کیجئے کہ میں بھی انھیں لوگوں کے حساب پر چلنے لگا۔ تو جب یہ سیارہ ایک پوری گردش اور طے کر لے گا تو ان کے حساب سے پھر

یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہوگا۔ اگر اس وقت مجھے کچھ ایسے ذرائع حاصل ہوں کہ میں اس زمین پر اپنے احباب سے فوراً رسل و رسائل اور نامہ و پیام کر سکوں تو وہاں سے جواب آئے گا کہ کرہ زمین پر اس وقت یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہے حالانکہ میرے نزدیک وہ دن یکم جنوری ۱۹۲۹ء تھا۔ کیا قریطو یہ معاملہ اسی طرح نہ ہوگا؟

ق۔ ہاں ہوگا تو ایسا ہی

س۔ اچھا ایک بات اور فرض کرو کہ وہ سیارہ جس پر میں جا اتر ا تھا، اپنے محور پر سال بھر میں صرف ایک مرتبہ گردش کرتا ہے۔ اور میں اس سیارہ پر اس طرف ہوں جو سورج کے سامنے ہے۔ تو جب یہ سیارہ اپنے فلک پر دو گردشیں کر چکے گا تو میں زمین کی طرف اس مقام کے عین بالمقابل ہوں گا جہاں سے میں روانہ ہوا تھا اور اگر میں نے آفتاب کی روشنی کے لحاظ سے وقت شماری کی ہوتی تو میرا کچھ بھی وقت ضائع نہ ہوتا۔ اور اگر اس وقت میں پھر اپنی زمین پر نازل ہو جاؤں تو اس وقت بھی میرے نزدیک یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہوگا۔ کیوں ہوگا یا نہیں؟

ق۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اگر ایک سال کا فرق اسی طرح معلوم کیا جاسکتا جس طرح کسی درخت کے تنہ کے اندر ہر سال کی لکیریں با حلقے دیکھنے سے معلوم کیا جاتا ہے تو واقعاً آپ ایک سال بدھے ہو گئے ہوتے۔

س۔ ب۔ قریطو! میں دیکھتا ہوں کہ تم میری بات نہ مانو گے۔ جو خیال تمہارے دل میں جم گیا ہے تم اسی کے غلام بنے رہو گے۔ اور اس مسئلہ پر جو دلائل پیش کئے جا رہے ہیں وہ خالی الذہن ہو کر نہ سنو گے۔ بقول تمہارا اگر کسی شخص کی عمر صحیح طور پر صورت دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے تو اس کا باعث یہ ہوگا کہ اس شخص کی صورت شکل میں کچھ تغیر واقع ہوا۔ اور یہی بات میں نے ابتدا میں کہی تھی۔ دیکھو! یہ تئیر ان کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوگا جو جسم کے مادی ذرات یا اعضاء جسمانی کے افعال میں ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ تغیرات اس دوسرے سیارہ پر دو گنی رفتار سے ہوتے تو میں ضرور بقول تمہارے بقدر ایک سال بوڑھا ہوتا یعنی اس شخص سے میری عمر ایک سال زیادہ ہوتی جو میری ہی ولادت کے روز پیدا ہوتا مگر ہوتا زمین ہی پر۔ اور جس صورت میں کہ میں اس دوسرے سیارہ پر ہر وقت نور آفتاب میں تھا۔ اور وہ سیارہ اپنے فلک پر دو گردشیں پوری کر چکا اور اس وقت میرے جسم کے اندر کسی قسم کے تغیرات واقع نہ ہوتے تو میں اس شخص سے جو میری ہی ولادت کے روز پیدا ہو کر زمین پر رہا تھا بقدر ایک سال چھوٹا ہوتا۔ اگر زمین پر نظام جسمانی کے اندرونی تغیرات دو گنی رفتار سے واقع ہوا کرتے تو طبعی حالات میں ہم لوگ چالیس برس کی ہی عمر میں اس قدر بوڑھے اور ناکارہ ہو جاتے جیسے کہ اب اسی سال کی عمر میں ہوتے ہیں۔

پس ظاہر ہو گیا کہ وقت جس کی پیمائش گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں، اور برسوں سے کی جاتی ہے اس کا انحصار بالکل اس میکانیکی واقعہ پر ہے کہ زمین اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے اور اگر اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے جس میں ہم چیزوں اور آدمیوں کی عمروں کا اندازہ ان کی صورتوں سے کرتے ہیں تو جس چیز کو وقت کہتے ہیں وہ بالکل ذرات مادی کی (کیمیائی) حرکت یا سرگرمی پر مبنی ہے۔ اور ہم اس کی پیمائش کسی چیز یا شخص کے درجہ انحطاط یا قلب ماہیت کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور اس صورت میں ہمارے پیمانہ کی اکائی وہ چیز ہوتی ہے جو جدید ہو۔

پس ثابت ہوا کہ جہاں تک دنیا کی خارجی اور کائنات کا تعلق ہے وقت ایک لاشعہ محض چیزوں ایک ہزار برس ایک دن اور ایک ہزار سال ہو سکتے ہیں۔ اور اگر احساس کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وقت محض ایک اعتباری چیز ہے۔ پس سمجھ لو! کہ وقت کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ہم ہمیشہ ایک ابدی "اب" یا "سرمئی حال" میں زندگی بسر کر رہے ہیں

مثنوی لالہ رُخ

ظامس مور کی معرکہ آرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا ہمیشہ نمونہ صرف... اجلدیں باقی رہ گئی ہیں
قیمت معہ محصول پھر

نقاب اٹھ جانے کے بعد

حضرت نیاز کے تین ہمیشہ افسانوں کا مجموعہ صرف ۵ جلدیں باقی ہیں معہ محصول ۸/-
(دونوں معہ محصول پھر میں)

مذاکرات نیاز

حضرت نیاز فقہوری کی ڈائری
اگر ابھی ملاحظہ سے نہیں گزری تو فوراً طلب فرمائیے۔ بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں
معہ محصول پھر

منیجر نگار

صحافت مغرب کی حیرتناک داستان

نیویارک ٹائمز کی ترقی کے ساحرانہ مناظر

نیویارک ٹائمز کا سب سے پہلا پرچہ ۷ اگست ۱۸۵۷ء کو شائع ہوا، لیکن ایک ایسی حقیر کوٹھری سے نہ جس میں کھڑکیاں تھیں، نہ الماریاں، نہ ٹیلی فون تھا نہ تار اور مقالات ادارہ ایک قدیم وضع کی ناتراشیدہ میز پر رکھے جاتے تھے جہاں ایک موم بتی سے زیادہ روشنی کا کوئی سامان نہ تھا۔

لیکن اب وہ ایک ایسی عظیم الشان عمارت سے شائع ہوتا ہے جس کی ۲۲ منزلیں ہیں اور ہر منزل کی وسعت سو اے بالائی تین منزلوں کی ۲۰ ہزار مربع گز کی ہے اور ہر منزل جدید ترین آرائش و زیبائش اور ضروریات صحافت سے آراستہ ہے

اس کی موجودہ اشاعت روزانہ تین لاکھ چاس ہزار ہے اور ہفتہ وار اڈیشن چھ لاکھ شائع ہوتا ہے۔ موجودہ اسٹاف جس میں ادارہ، تحریر، مراسلہ نگاری اور خبر رسانی کے تمام اشخاص شامل ہیں، دو ہزار نفوس سے زیادہ پر مشتمل ہے، جن کی سالانہ اجرت دس لاکھ گنی ہے

اس اخبار میں روزانہ ۱۷،۱۸ ٹن کاغذ کا خرچ ہے، یعنی سال میں ۶۴ ہزار ٹن کاغذ جس کی قیمت گیارہ لاکھ گنی ہوتی ہے۔ روزانہ ۴ ٹن سیاہی صرف ہوتی ہے جس کی سالانہ قیمت ۵۰ ہزار گنی ہوتی۔ اخبار موٹروں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے تقسیم ہوتا ہے جس کے مصارف دو لاکھ گنی سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ سب نتیجہ ہے ایک ایسے شخص کی فکر و محنت کا جو امریکہ کے ایک گالوں میں پیدا ہوا اور ٹائپ کمپوز کرنے والے کی حیثیت سے دنیا میں اول اول داخل ہوا۔ اس وقت تک دو کروڑ گنی وہ اس اخبار کے ذریعہ سے کمایا ہے جس میں سے تین فیصدی کے حساب سے اس نے حصہ داروں کو تقسیم کیا، باقی اخبار کی ترقی میں لگایا۔ بہ حالت موجود اس کی املاک کی قیمت ۳۰ لاکھ گنی ہے۔

اس اخبار کا نظم و نسق چھ شعبوں پر منقسم ہے۔ پہلا شعبہ خبروں سے متعلق ہے جس میں سیاسی، علمی، تجارتی،

تفیلی خبریں اور وہ خبریں جو لوہو و لعب، سفر و سیاحت، جرائم اور عدالت گاہوں سے متعلق ہیں فراہم کی جاتی ہیں، دوسرا شعبہ اذیت اور اس کے مددگاروں کا ہے جو مقالہ افتتاحیہ وغیرہ لکھتے ہیں، تیسرا شعبہ تجارتی ہے جس سے اشتہارات، نشر و اشاعت اور حسابات وغیرہ متعلق ہیں۔ چوتھا شعبہ میکانیکی ہے جس میں مشینیں وغیرہ شامل ہیں پانچواں شعبہ ملازموں کے کام کی جانچ اور ان کی اجرت وغیرہ سے متعلق ہے اور چھٹا شعبہ متفرق کاموں کو دیکھتا ہے۔

پہلا شعبہ جس کا تعلق خبروں سے ہے نہایت اہم ہے کیونکہ ایک اخبار کی اشاعت و ترقی کا انحصار اسی کی تکمیل پر ہے۔ یہ شعبہ ڈاک، ٹیلی فون، تار، لاسلی وغیرہ کی مدد سے تمام دنیا کی خبریں جمع کرتا ہے اور اس شعبہ کا صدر وہی حیثیت رکھتا ہے جو میدان جنگ میں سرعسکر کی ہوتی ہے۔ اس کے ماتحت تین سو سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے دہاں کی خبریں روزانہ بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے آدمیوں کو تار کے ذریعہ سے ہدایات بھیجتا رہتا ہے اور اس کی کوششیں یہی ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی اہم خبر شائع ہونے سے نہ رہ جائے اور سب سے پہلے نیویارک ٹائمز میں شائع ہو۔

مغرب کی صحافت میں بڑی زبردست مسابقت اسی امر میں ہوتی ہے کہ کون سب سے پہلے خبر شائع کرتا ہے۔ یہ شعبہ دو حصوں میں منقسم ہے ایک کا تعلق شہر کی خبروں سے ہے اور دوسرے کا تمام بیرونی دنیا سے۔ پہلے حصہ میں نیویارک اور اس کے چاروں طرف دو دو میل تک کی خبریں فراہم کی جاتی ہیں اور دوسرے میں ڈاک، لاسلی، ٹیلی فون اور تاروں کے ذریعہ سے تمام دنیا کے حالات اکٹھا کئے جاتے ہیں۔ اس شعبہ کے اڈیٹر دو ہوتے ہیں ایک دن کو کام کرتا ہے، دوسرا رات کو، ان کے ماتحتی میں ۱۰، ۱۱ مخبر کام کرتے ہیں جن میں سے ۲۱ صرف کھیل کود اور تفریحی خبروں کو فراہم کرتے ہیں۔

صبح کا اڈیٹر بہت تڑپ کے اگر تمام مخبروں کے فرائض متعین کرتا ہے کہ کس کس طرف جانا ہے اور اس کا ایک نقشہ بنا دیتا ہے جس کو چلتے وقت شام کی اڈیٹر کے سپرد کر دیتا ہے۔ شام ہوتے ہوئے دفتر میں شہر اور ساری دنیا کی خبریں جمع ہو جاتی ہیں اور ان کو شہر کی دو حصوں میں تقسیم کر کے متعلقہ اڈیٹروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو اپنے مددگاروں کو ان کے ذوق و استعداد کے لحاظ سے صحت و درستی حذف و اضافہ کے لئے تقسیم کر دیتا ہے لیکن انھیں اصل خبر میں کمی زیادتی کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ ان خبروں پر بُری یا بھلی تنقید کر سکتے ہیں، یہ کام صرف اڈیٹر کا ہے۔

روزانہ گیارہ بجے دن کو اخبار کا مالک و چیف اڈیٹر ایک وسیع کمرہ میں جو نہایت آراستہ ہے اور جس میں ایک بڑی مستطیل میز بچھی ہوئی ہے، اپنے تمام ماتحت اڈیٹروں کو بلاتا ہے اور تمام اہم مسائل پر گفتگو کرنے کے بعد

ہر مسئلہ میں یا ایسی متعین کرتا ہے اور اسی کے مطابق دن بھر کام کیا جاتا ہے۔

یہاں کے کتب خانہ میں ۲۰ ہزار بہترین کتابیں موجود ہیں جن سے اڈیٹر کام لیتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں انھیں کتابوں کی مدد سے دلائل و شواہد کی بنیاد پر لکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس اخبار کا مرتبہ ملک میں بہت بلند ہے اور اس کی حیثیت ایک حکم کی سی ہے۔ امریکہ کا کوئی گانچ اور کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جہاں اس اخبار کا باقاعدہ فائل نہ ہو اور وقت ضرورت اس سے استناد نہ کیا جاتا ہو۔

کتب خانہ میں دیواروں پر بڑے بڑے رنگین شیشے لٹکے ہوئے ہیں جن پر تصاویر کے ذریعہ سے اخبار کی تمام تاریخ درج ہے، پہلے یہ دکھایا ہے کہ اخبار کس طرح ایک دستی مطبع میں چھپتا تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے کس طرح ترقی کی یہاں تک کہ وہ بجلی کے ذریعہ سے کمپوز ہونے لگا اور بڑی بڑی عفریت پیکر مشینوں سے کام لیا جائے لگا، اخبار کی تقسیم و اشاعت کے جو ذرائع ہیں انھیں بھی تصاویر کے ذریعہ سے بتایا ہے اور وہ قدیم و جدید طریقے فوٹو گرافی کے بھی دکھائے ہیں جن سے اخبار میں کام لیا گیا اور اب لیا جاتا ہے۔

اخبار کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اشتہارات ہیں ورنہ محض اخبار کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ کاغذ کی قیمت سے بھی ۶ ہزار ڈالر کم ہوتی ہے۔

اشتہارات کی بابت اس اخبار کا اعتبار بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ اس وقت تک کوئی اشتہار شائع نہیں کرتا جب تک مشہرہ چیز کی خوبی کا اس کو یقین نہیں ہو جاتا، اس کے لئے ایک شعبہ الگ ہے جو صرف اس امر کی تحقیق کرتا رہتا ہے اور ہر ممکن کوشش سے حقیقت کا علم حاصل کرتا ہے۔

اس اخبار میں جو اشتہار شائع ہوتے ہیں ان کی ترتیب اور ان کے عنوانات اس قدر دلچسپ ہوتے ہیں کہ پبلک پر ان کا بہت اثر پڑتا ہے اور چونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس اخبار میں کوئی اشتہار لغو اور جھوٹا نہیں ہوتا اس لئے مشہرین کا مال بہت فروخت ہوتا ہے اور لوگ کثرت سے اشتہار بھی دیتے ہیں۔

اجرت اشتہار فی سطر نصف ڈالر (تقریباً ۴۰) لی جاتی ہے اور اس ذریعہ سے سالانہ آمدنی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر سے کم کسی طرح نہیں ہوتی

یہاں صوبائی مشینیں اور آلات جدیدہ لگے ہوئے ہیں وہ دو حصوں میں منقسم ہیں ایک حصہ تحریر و ادارہ سے متعلق ہے اور دوسرا طباعت کے شعبہ سے۔ عمارت کے نیسے درجہ میں تین کمرے ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ان سے باہر آواز کسی طرح نہیں جاسکتی۔ ایک کمرے میں نو برقی ٹائپ رائٹر رکھے ہوئے ہیں جن کا تعلق براہ راست اسوشیٹڈ پریس سے ہے یعنی ہر وقت وہاں سے خبریں آتی ہیں اور ان خود ان ٹائپ رائٹروں میں چھپتی رہتی ہیں ہر منٹ میں ۶۰ لفظ کے حساب سے یہ آلات کام کرتے ہیں اور کوئی ایک شخص بھی یہاں موجود نہیں ہوتا۔ نیو یارک ٹائٹلس

لئے خاص اپنے تار الگ کھینچوائے ہیں جنکا تعلق براہ راست اسوشیٹڈ پریس کے صدر دفتر سے ہے۔ اس کمرہ سے ملا ہوا دوسرا کمرہ لاسکلی کا ہے جہاں دو آدمی ہر وقت اپنے کالوں سے آلہ لگائے ہوئے ہزاروں میل کی خبریں حاصل کر کے لکھتے رہتے ہیں۔ تیسرا کمرہ خبروں اور برقیات کا ہے۔ یہاں ۶۵ کلرک تار کے ہیں۔ جو ہر وقت کم از کم ستر ہزار الفاظ کی خبریں حاصل کرتے اور نیویارک ٹائمز کمپنی کے دوسرے اخباروں (ٹریبون۔ گلوب۔ ہرلڈ وغیرہ) کے پاس بھیجتے رہتے ہیں۔ ٹائمز کے تین تار علیحدہ کھینچے ہوئے ہیں جو واشنگٹن، شکاگو اور ملی فاکس کے دفاتر سے براہ راست ملتے ہیں۔

ٹیلی فون کے آلات بھی اتنے ہی ہیں۔ خود عمارت کے اندر ۸۵ تار ٹیلی فون کے ہیں جو ۲۹۰ شاخوں میں تقسیم ہو کر عمارت کے ہر حصہ تک پہنچتے ہیں اس کا اکتینج بھی یہیں ہے جہاں چودہ عورتیں ہر وقت کام کرتی ہیں۔ علاوہ ان کے پانچ تار ٹیلی فون کے بالکل علیحدہ ہیں جو دور دراز مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ گرمی کے لئے ایک خاص تار اور لگا ہوا ہے جو چیف اڈیٹر کے گرمائی مقام سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک اور وسیع کمرہ میں ٹیلی فون کی تین شاخیں ہیں جو مختصر خبروں اور روز کی معمولی گفتگو کے لئے وقف ہیں۔ ہر روز تقریباً ۲۵۰۰ آدمی اس دفتر سے گفتگو کرتے ہیں

ظاہر ہے کہ جس دفتر میں ہزاروں آدمی کام کرتے ہوں، سیکڑوں مقامات سے ہر وقت خبریں آتی رہتی ہوں، ہزاروں اعلانات و اشتہارات کا انتظام ہو، تمام دنیا کے اخبارات کے ضروری تراشے جمع ہوتے ہوں بات بات میں ادارہ کے تمام افراد کو مشورہ کی ضرورت ہوتی ہو وہاں اگر ایک دوسرے کے ساتھ ٹیلی فون کا تعلق نہ ہو تو کیونکر کام چل سکتا ہے۔ اس لئے عمارت کا کوئی حصہ، کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں تار اور ٹیلی فون نظر نہ آتا ہو۔

اس کا میکانیکی حصہ یعنی وہ حصہ جس کا تعلق مشینوں سے ہے نہایت وسیع ہے۔ کمپوز کرنے کے لئے لینیوٹائپ اور موٹو ٹائپ مشینوں کے علاوہ اور بڑی بڑی مشینیں اخبار اور تصاویر چھاپنے کی ہیں۔ اشتہارات کا حصہ کمپوز کرنے کے لئے موٹو ٹائپ مشین سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ اشتہاروں کے عنوان مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو اور ظاہر ہے کہ ان کے لئے ہمیشہ نئے ٹائپ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لینیوٹائپ مشین کے ذریعہ سے ایسے ٹائپ ہر وقت آسانی سے ڈھل جاتے ہیں

یہاں بیس مشینیں طباعت کے لئے ہیں جن سے ہر گھنٹہ میں ۴ لاکھ کاپیاں اخبار کی نکلتی ہیں جس کا حجم ۴ صفحے سے لے کر ۴ صفحات تک ہوتا ہے۔ یہ مشینیں بالکل نیچے کے درجہ میں ہیں اور اس کا رقبہ ۲۸۵۰۰ مربع گز ہے۔ جن موٹروں سے یہ مشینیں چلائی جاتی ہیں ان میں ۱۶۰۰ کھوڑوں کی برقی قوت صرف ہوتی ہے۔ جب اخبار چھپ جاتا ہے تو اشاعت کے کمرہ تک بجلی ہی کے ذریعہ سے پہنچایا جاتا ہے۔ علاوہ ان کے دس مشینیں تصاویر چھاپنے

کے لئے ہیں یہ روٹو گرافری مشینیں ہیں جن کے میلنوں پر تصاویر کھد جاتی ہیں۔ ان سے ہر گھنٹہ میں ۹۰ ہزار کاپیاں مصور حصہ کے پھپتی ہیں جس کا حجم ۸۰ صفحات کا ہوتا ہے۔

نیاز

آئینہ نمبر نگار کا

جنوری ۱۳۲۲ء کا ہوگا

حسب معمول بہت ضخیم اور بہت دلچسپ ہوگا اور
غالب کو

جس رنگ میں پیش کرے گا وہ اس سے قبل آپ کی نگاہ سے کبھی نہ گزرا ہوگا

غالب کی رنگین تصویر بالکل نئی ہوگی جو کسی

رسالہ میں شائع نہیں ہوئی

منی آرڈر کے ذریعہ سے پانچ روپیہ نگار کا سالانہ چندہ بھیجنے میں آپ کو چار آنے کا فائدہ ہے
ہر خریدار کو خواہ وہ قدیم ہو یا جدید چندہ وصول ہونے پر حسب ذیل کتابیں رعایتی
قیمت پر علاوہ محصول کے مل سکتی ہیں۔

ظریف شاعروں کا تذکرہ جذبات بھاشہ شاعر کا انجام فراست الیہ فراست التحریر کیل

مینجر نگار لکھنؤ

علوم ریاضیہ کی اہمیت

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان بچوں کو علوم ریاضی کے ساتھ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی اور چونکہ خود ان کے والدین کسی وقت ”مسلمان بچے“ رہ چکے ہیں اور ان کو بھی اس طرف کبھی میلان نہیں ہوا۔ اس لئے وہ بھی اس طرف اعتناء نہیں کرتے اور اس کو نہایت ہی معمولی اور غیر اہم بات سمجھ کر مال دیتے ہیں۔ میں نے بعض ذی شعور اور ہوشمند مسلمانوں کو اس امر پر فخر کرتے سنا ہے کہ انھیں حساب و ریاضی سے کبھی مس پیدا نہیں ہوا، کیونکہ یہ بقالوں کے ذوق کی چیز ہے اور وہ تو اس حکمران مذہب کے افراد ہیں جس کا کام ہی ”کرم بے حساب“ اور ”نوازش بے شمار“ ہے۔ مسلمانوں کی بد بختی کے جہان اور اسباب ہیں، انھیں میں سے ایک یہ ذہنیت بھی ہے جو انھیں علوم و فنون کی ترقی سے باز رکھ رہی ہے۔

اگر ان کو معلوم ہو کہ تاریخ انسانی میں علوم ریاضیہ کی کیا اہمیت ہے اور ان پر تمدن و تہذیب کی ترقی کا کس حد تک انحصار ہے تو شاید وہ بجائے فخر کے اپنے آپ سے شرم کرنے لگیں۔ کیونکہ موجودہ دور ترقی میں کسی شعبہ حیات کا کوئی علم ایسا نہیں ہے جو علوم ریاضیہ کی مہارت بغیر کسی کو حاصل ہو گیا ہو۔ مثلاً آپ غور کیجئے کہ اس وقت علم طب نے کس قدر ترقی کی ہے اور جدید نظریہ جراثیم نے کتنا عظیم انقلاب علاج کے قدیم نظریوں میں پیدا کر دیا ہے لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں کامیابی ممکن تھی اگر ”خوردین“ کی ایجاد نہ ہوتی اور روشنی کے نوامیس اور نور کے انعکاس و انکسار کا حال نہ معلوم ہوتا۔ پھر کیا یہ تمام چیزیں بغیر علوم ریاضیہ کی مدد کے دریافت ہو سکتی تھیں؟

اگر لارڈ کالون مشہور ریاضی داں ان حالات کا علم نہ حاصل کر لیتا جنکی بنا پر برقی رد کو طویل تاروں پر آسانی کے ساتھ دوڑایا جاسکتا ہے تو کیا بحری تاروں کا بچھایا جانا ممکن تھا۔

اگر پٹرول کا آلہ اصول ریاضی کے ماتحت نہ بنایا جاتا تو کیا موٹروں پر بیٹھ کر دنیا کی سیاحت کو آسان بنا لینا اور طیاروں پر سوار ہو کر فضا، آسمانی میں گردش کرنا ممکن تھا؟

افلاطون کا قول ہے کہ ”عالم آفرینش کا راز اعداد میں پنہاں ہے“ وہ کہا کرتا تھا کہ ”خدا سب سے بڑا مهندس اور ریاضی دان ہے“ اس نے اپنے گھر کے دروازہ پر یہ کتبہ لکھ کر لٹکا دیا تھا کہ ”وہ شخص

جو ہندسہ و ریاضی سے نابلد ہے اس گھر میں داخل نہ ہو۔ — بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوال میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، لیکن ہم اگر ان تمام علوم کی ترقی پر نگاہ ڈالیں جنہوں نے اسباب تمدن و معاشرت کو وسیع و آسان بنا دیا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی تکمیل بغیر ریاضی کی مدد کے ممکن ہی نہ تھی۔

یقیناً اس وقت یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ انسان نے کب اعمال حسابی سے کام لینا شروع کیا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس نے اس علم کا حصول اول اول بالکل بچہ کی طرح شروع کیا ہوگا اور پھر رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب علوم ریاضیہ کا نشو و نما اس بڑے درخت کا سانسو و نمائے جس سے سیکڑوں شاخیں اور پھر ان شاخوں سے ہزاروں ٹہنیاں پیدا ہو جائیں — اسی لئے ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ وہ علوم ریاضی کے فروغ میں سے کس کو حاصل کرے۔ آیا وہ برق و کھربا کا حسابی علم حاصل کرے یا موجات کا، وہ جبر و مقابلہ کو دیکھے یا حساب تفاضل و تکامل (CALCULUS) کو۔ وہ فلکیات پر نظر ڈالے یا نوائس نوپر۔ الغرض علوم ریاضیہ کی اب اتنی شاخیں ہو گئی ہیں کہ ایک انسان کے اختیار سے باہر ہے کہ ان سب کا سرسری مطالعہ بھی کر سکے۔

زمانہ قدیم میں کب علوم ریاضیہ نے قابل ذکر ترقی کی، اس کے تعین دشوار ہے لیکن اب سے ہزاروں سال قبل کی تاریخ میں ان کی ترقی کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

چنانچہ مصر میں ہرم کبیر (Great Pyramid) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی اس وقت بھی حیرت انگیز حد تک ترقی کر چکی تھی۔ اس تعمیر کے چاروں پہلو ٹھیک چاروں سمت (شرق و غرب، شمال و جنوب) پر بنے ہوئے ہیں جو سوائے اس کے کسی صورت سے ممکن نہ تھا کہ کسی ایک ستارہ کا ٹھیک ایک ہی وقت غروب و طلوع کے وقت مطالعہ کیا جاتا، لیکن اس سے بھی زیادہ ثبوت اس وقت کی ریاضی دانی کا یہ ہے کہ ہرم کی بلندی اس حساب سے رکھی گئی ہے کہ اگر اس کو ایک ارب سے ضرب کریں تو حاصل ضرب آفتاب اور زمین کے بعد کے برابر ہوگا۔

اس سے بھی زیان حیرتناک کا زمانہ قدیم مصریوں کا یہ ہے کہ انھیں محیط اور قطر کی نسبت معلوم تھی۔ اس میں شک نہیں کہ آج حساب کا ہر معمولی طالب علم بتا سکتا ہے کہ یہ نسبت ۳۱۶/۳ ہے لیکن اہل مصر کو اب سے ۵ ہزار سال قبل اس کا علم حاصل تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہرم کے ایک جانب کے طول کو قاعدہ ہرم سے اس کی بلندی پر تقسیم کیا جائے تو حاصل قسمت ۵۰۸/۱۵۷۱۰۸۱۶۰ کا نصف ہوگا۔ (یعنی جو نسبت محیط و قطر میں ہے اس کا آدھا) ظاہر ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔

قدیم مصری کاہن اہمیس کی ایک نہایت ہی پُرانی کتاب جو حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے اس کے دیکھنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ حساب میں کسور وغیرہ سے بخوبی واقف تھے۔ اس کتاب میں ایک مثلث مساوی الساقین اس نے بنایا ہے جن میں سے ہر ایک ساق کا طول دس ہے اور قاعدہ کا طول چار۔ اور پھر نیچے لکھا ہے کہ اس کی مساحت ۱۶/۴ ہے جو بالکل صحیح ہے

علم ہندسہ کی ابتدا سب سے پہلے مصر میں ہوئی کیونکہ ہیرودوٹس کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ سے ۵۰۰ سال قبل مصر میں قابل کاشت زمین برابر برابر مربعوں میں تقسیم تھی تاکہ محاصل زمین کے وصول کرنے میں سہولت ہو، لیکن ان مربعوں کے حدود دریا کے نیل کے سیلاب سے مٹ جاتے تھے اور پھر حد بندی کی خدمت اس وقت کے مہندس کے سپرد ہوتی تھی

افلیدس مشہور ریاضی دان، اسکندریہ ہی کے مدرسہ میں ریاضیات کا استاد تھا اور مسیح سے تقریباً ۳۰۰ سال قبل خطوط و مثلثات پر لکچر دیا کرتا تھا، پھر اقلیدس کی مہارت اور شغف ریاضیات کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ اقلیدس کا مفہوم ہی علم ہندسہ ہو کر رہ گیا

قدیم ریاضی دانوں میں ارخمیدس بھی خاص امتیاز کا مالک تھا جس نے کثرت سے اس فن کی کتابیں تصنیف کیں۔ سب سے پہلا یہی ریاضی دان تھا۔ جس نے ریاضی سے عملی امور میں کام لیا۔ اس نے ریاضی کے اصول پر بہت سے آلات کو منطبق کر کے ان کی حقیقت معلوم کی۔ مثلاً یہ کہ پھیلا دار گاڑی کے ذریعہ سے ہم ان اوزان کو کیوں سہولت کے ساتھ منتقل کر سکتے ہیں جو ہاتھوں سے ممکن نہیں یا یہ کہ ہم اخروٹ اور بادام کو ایک آلہ کے ذریعہ سے کیوں آسانی سے توڑ سکتے ہیں۔ اس کو مرکز نقل کا بھی حال معلوم تھا۔ اور اس نے بہت سے چھوٹے چھوٹے آلات ایجاد کئے جن میں سے ایک پانی اوپر اٹھانے کا آلہ تھا اور جو کہیں کہیں اب بھی رائج ہے۔ اس نے منجینیق بھی تیار کی تھی جس کی وجہ سے اہل رومہ شہر سیراقوسہ کی شہر پناہ کو توڑ کر اندر داخل نہ ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک آتش فشانی شیشہ ایسا تیار کیا تھا جس کا عکس ڈالنے سے اہل رومہ کی کشتیوں میں آگ لگ جاتی تھی۔ اس شخص کی موت بھی عجیب طرح ہوئی۔ یعنی جب اہل رومہ شہر سیراقوسہ کو فتح کر کے اندر داخل ہوئے تو ارخمیدس وہیں اپنے اپنے گھر میں موجود تھا اور ریاضی کے کسی مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کوئی رومی سپاہی اس کے گھر میں داخل ہوا تو اس نے منع کیا کہ ہندسہ کے نقشے پر پاؤں نہ رکھے جس پر وہ غور کر رہا تھا۔ یہ سن کر سپاہی نے اس کو قتل کر دیا حالانکہ سپہ سالار کا حکم تھا کہ ارخمیدس کو کوئی اذیت نہ پہونچائی جائے

اچھا اب قدیم زمانہ کو چھوڑ کر اس عہد ترقی میں آئیے جس کی شعاعیں اطالیہ سے نمودار ہو کر ساری دنیا پر پھیل گئیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا شخص جس کا نام دنیا کے ہر گھر پر پڑھے شخص کو معلوم ہونا چاہئے گلیلو ہے جس کے ساتھ دنیا نے وہی سلوک کیا جو ہر روشن خیال دشمن تقلید کا ہوتا ہے۔ یہ جامعہ بنیاد میں طب کا طالب علم

تھا، ایک دن اتفاق سے اس کمرہ میں چلا گیا جہاں ہندسہ کا درس دیا جا رہا تھا۔ اس کو اس فن سے دلچسپی ہوئی اور اسی وقت سے اس نے طب چھوڑ کر ریاضیات کو اپنا موضوع جستجو بنالیا۔

علم الجیل (Mensuration) کے وضع کرنے کا فخر اسی شخص کو حاصل ہے جس کی بنا پر زمین کی حرکت، نظام شمسی، مدوجزرا، بارود کی قوت اور گولی کی سرعت کا حال معلوم ہوا۔ یہ گلیٹو ہی کا طفیل ہے کہ جہاز کے ناخداؤں کو پانچ سال قبل مدوجزرا کا حال معلوم ہونے لگا اور فلکیوں کو کسوف و خسوف کے اوقات کا متعین کرنا آسان ہو گیا اگر وہ نوآئیں حرکت دریافت نہ کرتا تو ان امور کی تعین کسی طرح نہ ہو سکتی۔

دور بین کا موجد بھی یہی گلیٹو تھا اور اسی نے سب سے پہلے تھرمائیٹر بنایا اور ثابت کیا کہ ہوا کے دباؤ سے پمپ کا پانی ۳۰ گز سے زیادہ اوپر نہیں چڑھ سکتا

اس کے بعد نیوٹن کا زمانہ آیا اور اس وقت سے علم و تحقیق کی وسعت شروع ہوئی اور باہم اہل فضل میں بحث و مشاورت کی بنیاد پڑی ایک شخص اگر کوئی علمی مسئلہ دریافت کرتا تھا تو اس کا اعلان کرنا تھا اور دنیا کے دوسرے علماء اس پر جرح و تعدیل کرتے تھے۔

نیوٹن کے پاس سوئس اسے ایک ریاضی کا مسئلہ آیا جسے فیلسوف لیٹنبرج چھ ماہ میں حل کر سکا تھا۔ یہ سوال ۲۹ جنوری ۱۶۸۷ء کو نیوٹن کے پاس آیا اور دوسرے ہی دن حل کر کے بھیج دیا۔

کہا جاتا ہے کہ علوم ریاضیہ خشک ہیں اور ان میں وہ دلچسپی نہیں ہے جو طبیعی و اجتماعی مسائل میں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ریاضیات کی دلچسپی سب علوم سے زیادہ ہے کیونکہ بغیر اس کے دیگر علوم بیکار ہیں۔ مثلاً ماہرین طبیعیات و علم الکیمیا کے تمام اعمال دباؤ اور مقدار و کمیت کی قوت سے متعلق ہیں، لیکن ان کا علم اسی وقت ہو سکا جب نیوٹن نے ریاضیات عالیہ کے اصول و قواعد منضبط کئے۔

فرض کیجئے ایک انجنیر پل تیار کر رہا ہے، لیکن جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ لوہے کی قوت کیا ہے اور پل کے ہر نقطہ پر کتنا دباؤ پڑ رہا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور یہ باتیں صرف ریاضی کی مدد سے معلوم ہو سکتی ہیں، اسی طرح آپ مکان کی تعمیر، نہر کی تیاری، میناروں کی ساخت اور تمام اعمال انسانی جن کا تعلق ترقی تمدن و تہذیب سے ہے، ریاضی کے ممنون کرم ہیں۔

نیوٹن کے بعد دو صدی گزرتے پر ایک نوجوان انگریز (آڈمس) پیدا ہوا جس نے فلکیات میں نہایت حیرت ناک اضافہ کیا۔ یہ اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا اور سوائے کاغذ و قلم کے اس کے پاس کوئی آلہ نہ تھا کہ اس نے ایک نئے سیارہ پلٹون کا اکتشاف کیا۔ یہ اکتشاف کیوں عجیب و غریب سمجھا جاتا ہے؟ اس کی حقیقت یہ ہے

کہ ایک سیارہ جس کا نام اورانوس ہے، آفتاب سے ۱۸ ملین میل دور ہے، لیکن علمائے ہدایت حیران تھے کہ یہ اپنے مدار پر کیوں حرکت نہیں کرتا حالانکہ اس کا قطر، اس کا حجم، اس کا بعد آفتاب سے اور اس کی سرعت معلوم کرنے کے بعد اس کا مدار حرکت متعین کیا گیا تھا۔ یہ مشکل پٹھون کی دریافت سے دور ہوئی جو اورانوس سے زیادہ دور واقع ہے اور جس کی وجہ سے اورانوس کی حرکت میں یہ تغیرات واقع ہوتے تھے۔

اس طرح اگر آپ علوم ریاضیہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر دلچسپ و اہم ہے اور دنیا کی ترقی کس درجہ اس کی ترقی کی ممنون ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ طبیعیات سے دلچسپی لیں، ہیئت کو پسند کریں، طب کی طرف متوجہ ہوں اور دیگر علوم کو حاصل کریں، لیکن ریاضیات کو نظر انداز کر دیں جو حقیقتاً بنیاد ہے، ہر علم و فضل کی کامیابی و نشر و اشاعت کی۔

دکن

قدیم، قلمی، نایاب، کم یاب، اور جدید مطبوعات موقت الشیوع رسائل قانونی، نصابی، علمی، ادبی، سرکاری، مطبوعات اور

اعلیٰ حضرت حضور نظام ہندگان عالی

کی رنگین تصاویر مبارک، دکن کے مناظر، اور آثار قدیمہ کی تصاویر اور شاہیر دکن کی تصویریں اور عام کتابیں
ادارہ علمیہ ناشر و کتب فروش عابد بلڈنگس حیدر آباد، دکن

طلب فرمائے
فہرست مفت طلب کی جاسکتی ہے فقط

باب الاستفسار

(جناب سید محمد ذکی صاحب - پھولپور)

بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے سب سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے
اور شروع میں ان کو کیا کیا پڑھانا چاہئے اگر لڑکوں اور لڑکیوں
کے لئے کوئی جداگانہ طریقہ مناسب ہو تو اس کا بھی تفریق فرمائیے

(نگار) آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے لیکن عرض یہ ہے کہ ہماری بے بصریوں نے زندگی
کی اور راہوں کو کیا منور بنا رکھا ہے کہ اس طرف توجہ کی جانی ذلت و پستی کے جہاں اور بہت سے اسباب پیدا کئے
گئے انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ایک قوم کے عروج و زوال میں سب سے زیادہ اہمیت اسی
مسئلہ کو حاصل ہے، اور قیامت یہ ہے کہ ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانان ہند نے اسی کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔
دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہوا ہے جس نے صحیح اصول و میقراطی (Democracy) پیش کر کے جہل و تاریکی کی مخالفت کی اور فکر و تدبیر کی ہدایت کر کے گویا بتایا کہ مسلمان نام ہے اس سہتی کا جو وقت
کے ساتھ دے سکے جو زمانہ کا نبض شناس ہو اور جو مختلف مذاہب کے مختلف حالات کے لحاظ سے اپنے آپ میں
امیرانہ و فرمانروایانہ تبدیلی پیدا کر سکے۔ یہی مدعا ہے اس غور و فکر سے جس کی ہر جگہ قرآن میں تاکید کی گئی اور یہی
مقصود ہے اس جدوجہد اور سعی و عمل سے جس کا درس ہزاروں ہی جگہ قرآن مجید میں نظر آتا ہے
لیکن افسوس ہے کہ بعض مسلمانوں نے اسلام کی اصل روح کو تو نظر انداز کر دیا اور محض ظواہر و مراسم کی پابندی کو حاصل
مذہب قرار دے کر راستہ سے بھٹک گئے۔ یہی وہ ذہنیت تھی جس نے ہمارے یہاں کے نصاب و

اصول تعلیم کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔
اب تو خیر اس قدر غمومیت کے ساتھ نہیں، لیکن چند سال قبل تک یہ حالت تھی کہ شاید ہی کوئی مسلمان بچہ
ایسا ہو جس کے سامنے سب سے پہلے "قواعد بغدادی" نہ رکھا جاتا ہو۔

مقصود اس کا یہ ہوا کرتا ہے کہ مسلمان بچہ شروع ہی سے خط نسخ کا عادی ہو اور عربی الفاظ
ادا کر سکنے کے لئے اس کی زبان ٹوٹنے لگے، کیونکہ قواعد بغدادی کے بعد ہی پارہ عم شروع کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کے
بعد صرف کلام مجید پڑھایا جاتا ہے میرے نزدیک یہ نصاب قابل ترمیم ہے، کیونکہ اس
سے بچہ کے قواء ذہنیہ پر نہایت خراب اثر پڑتا ہے۔ اصولاً شروع میں بچوں کے سامنے ایسی چیز پیش کرنا چاہئے کہ اس
سے اس کا ذہن مشغول نہ ہو اور دلچسپی پیدا ہو سکے۔ اس لئے کلام پاک کے ساتھ ہی مادری زبان کی تعلیم
اگر آپ اول اول اس کے سامنے صرف غیر زبان ہی کی کتاب رکھ دیں گے تو وہ گھبرا جائیگا

اور اس کا دماغ منحرف ہو کر آخر کار پڑھنے ہی کی طرف سے بیزار ہو جائے گا
اس کے علاوہ انسان فطرتاً جب سوچتا ہے تو وہ "کیا" اور "کیوں" کے سوالوں سے پریشان کر ڈالتا ہے
کوئی نئی چیز آتی ہے یا کوئی نئی بات بتائی جاتی ہے تو وہ "کیا" اور "کیوں" کے سوالوں سے پریشان کر ڈالتا ہے
جو لوگ نفسیات تعلیم سے واقف نہیں ہیں وہ ان سوالوں کا جواب غصہ سے دے کر انھیں خاموش کر دیتے ہیں، لیکن جو
اس سے آگاہ ہیں وہ ان سوالوں کا جواب دے کر اس کی خواہش جستجو کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ اس اصول کو
سامنے رکھ کر اہل مغرب نے کنڈرگارٹن طریق تعلیم رائج کیا ہے اور جس چیز کا نام ان کے سامنے آتا ہے اس کو مجتم
صورت میں پیش کر کے اس کی تفصیل و تشریح بتانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک تو
یہ کہ شروع ہی سے بچہ کی معلومات میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور دوسرے یہ کہ کتابی علم کے ساتھ ساتھ اس میں عملی
جستجو پیدا ہونے لگتی ہے جو اصل راز ہے انسان کی ذہنی و دماغی ترقی کا

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ غیر زبان کی..... تعلیم کا اثر ایک بچہ کے دماغ
پر کیا ہوگا، جبکہ اس کو نہ کسی لفظ کے معنی بتائے جاسکتے ہیں اور نہ حقیقتاً آپ ہی کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کو
کچھ سمجھایا جائے۔ اس صورت میں ایک خرابی تو وہی پیدا ہوتی ہے جو ابھی عرض کر چکا کہ بچہ کا ذہن تعلیم کی
طرف سے منحرف ہونے لگتا ہے اور دوسرا نقص یہ ہے کہ کلام مجید کی صحیح عظمت کو سمجھنے سے قبل ہی اس کے دماغ
میں یہ عقیدہ منقوش ہو جاتا ہے کہ قرآن پاک سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کی تعلیمات پر عمل ہو یا نہ ہو، محض اس کا
طوطے کی طرح پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ چنانچہ اسی خرابی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بجائے اس کے کہ عام مسلمانوں میں
قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر غور کرنے کا شوق پیدا ہو اس کی بالکل بے تکیہ کی طرح پرستش کی جا رہی ہے۔

آپ دیکھیں کہ وہ بہتر سے بہتر اطلس و کجواب کے غلافوں میں، آبنوس و صندوق کی بیش قیمت رحلوں پر تو ضرور نظر آتا ہے، لیکن دل و دماغ میں اس کی تعلیم کا ہلکے سے ہلکا نقش بھی نہیں اس کو جب کھولیں گے تو پہلے بوسہ دیں گے، جب پڑھ چکیں گے تو ہاتھ پر دم کر کے اس ہاتھ کو سارے جسم پر پھیر لیں گے، لیکن حال یہ ہے کہ اس کے بعد ہی مکر وہ سی مکر وہ منصبت میں بھی مبتلا ہونے سے کوئی عذر نہ ہوگا

چینی کی رہا۔ بیوں پر زعفران کے رنگ سے آیت الکرسی اور سورہ لیس لکھ لکھ کر لوگوں کو بلایں گے، اس کی آیات کے اعداد نکال کر نقش و تعویذ بھر بھر کر گلے میں لٹکائیں گے بازو پر باندھیں گے، دریا کی ٹھیلیوں کو دودھ تین چلوں تک آٹے میں لپیٹ لپیٹ کر کھلائیں گے اس کے اوراق کی ہوا دے دے کر مرض کا ازالہ چاہیں گے، الغرض وہ سب کچھ کریں گے جو مفسر قرآن کے خلاف ہے، اور کبھی ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ ان حرکات کو قرآن پاک کی حقیقی عظمت سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ یہ حقیقتاً قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کی اخلاقی تعلیم کی طرف سے بے پرواہ بنادینے والا ہے

بعض خاندانوں میں یہ بھی رواج ہے کہ بچوں کو ابتداء میں قرآن صرف پڑھایا ہی نہیں جاتا بلکہ حفظ کرایا جاتا ہے۔ اس سے بہت قبل جب تحریر و طباعت کا رواج نہ تھا یا تھا تو بہت کم، اس وقت تو یقیناً اس کی ضرورت تھی کہ قرآن پاک کو اتنے سینوں میں محفوظ کر دینا چاہئے کہ اس کے محو ہونے کا اندیشہ نہ رہے لیکن اب کہ طباعت کے عام ہو جانے سے لاکھوں نسخے اس کے ہر سال شائع ہوتے رہتے ہیں اور حفاظ کی تعداد بھی بہت کافی ہو گئی ہے، ہر جگہ کے دماغ پر ایسا سخت بار ڈالنے کی ضرورت نہیں البتہ اگر کوئی بچہ اپنی دماغی حالت کے لحاظ سے اس کے لئے موزوں ہے تو بیشک اس کو قرآن پاک بھی حفظ کرانا چاہئے

قرآن مجید کے پڑھنے اور یاد کرنے کا صحیح وقت وہی ہے جب بچہ میں اخلاقی تعلیم کے لئے پوری سمجھ پیدا ہو جاوے اور وہ قرآن مجید کو صرف اس لئے نہ پڑھے کہ محض الفاظ کا زبان سے ادا کرنا ہی اس کے لئے کافی ہے۔ البتہ اگر اس کے جواب میں کوئی شخص یہ کہے کہ اس کا فائدہ اور کچھ ہو یا نہ ہو یہ کیا کم ہے کہ اس سے برکات کا نزول ہوتا ہے، تو چونکہ اس کا تعلق انفرادی سکون و اطمینان سے ہے۔ اس لئے کوئی حرج نہیں وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن بہر حال یہ اس کا مانع نہیں کہ کلام مجید کے ساتھ مادری زبان کی کوئی کتاب اس کے سامنے پیش نہ کریں تاکہ اس کو تعلیم کی طرف سے بیگانگی نہ پیدا ہو۔

بہر حال نفسیات تعلیم و نفسیات انسانی دونوں حیثیتوں سے ضروری و مناسب یہی ہے کہ سب سے پہلے بچہ کے سامنے اس کی مادری و ملی زبان کی کتابیں پیش کی جائیں تاکہ ان کے سمجھنے میں اس کو زحمت نہ ہو اور جب نفع و فائدہ اس کے ذہن میں بچسکی آجائے تو پھر اس کے دماغی حالت کے لحاظ سے جو علم و فن مناسب ہو اس کی تعلیم دی جائے۔

میری رائے میں ہر بچہ کے لئے آغاز میں ایک ہی نصاب کبھی مفید نہیں ہو سکتا اور اسی لئے ابتدائی کتابوں کی تعلیمیں بیکار ہے یہ ہر شخص یا ہر معلم کو اپنی جگہ غور کر کے دیکھنا چاہئے کہ بچہ کے ذہن و دماغ کے لحاظ سے کس قسم کی کتابیں پڑھانی چاہئے۔ اور جب یہ ابتدائی منزل گزر جائے تو پھر دنیا کے جس کام میں اس کو لگانا ہے۔ یا جس فن و مشغلہ کے ساتھ اس کی فطری دلچسپی ظاہر ہو، اسی کی تحصیل میں اس کو لگا دینا چاہئے۔

— یہ ایک ایسا اصول ہے جو لڑکا اور لڑکی دونوں پر حاوی ہے اور کسی تفریق کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک مسئلہ دوسری زبانوں کی تحصیل کا ہے سو اس کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان بچہ چاہتا ہے کہ اپنے بچہ کو علمی یا ادبی دنیا میں لائے تو اس کے لئے انگریزی کے ساتھ فارسی اور عربی دونوں کا علم ناگزیر ہے، لیکن اگر زندگی کسی خاص صنعت یا پیشہ کے ذریعہ سے بسر کرنا ہے تو بیشک یہ ضروری نہیں، گو بلند و شایستہ سوسائٹی حاصل کرنے کے لئے اس کی اہمیت پھر بھی قائم رہتی ہے

اسی کے ساتھ ایک بات اور ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ اپنے بچہ کو جو تعلیم جس اسلوب کے ساتھ جی میں آئے دیجئے لیکن اس کے فطری ذوق جستجو و تحقیق کو کبھی نہ محو ہونے دیجئے، کیونکہ بلند نظری، وسعت خیال، تربیت ذہن، علوئے فکر، اصابت رائے، اور صحت ضمیر صرف اسی طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ غور کرنے کی عادت ڈالی جائے اور ایک بات کی صداقت کی دلیل صرف یہ نہ پیش کی جائے کہ اس سے پہلے غرض لوگ ایسا کہہ گئے ہیں یا ایسا کرتے تھے یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر دماغ یہ اجتہادی کیفیت نہیں رکھتا، لیکن اگر کسی بچہ میں شروع سے یہ رنگ پایا جائے تو اس کو فنا نہ کرنا چاہئے، کیونکہ دنیا میں ایجاد و اختراع، ابداع و اجتہاد، نہضت و ارتقاء، اقدام و مسابقت اور تمام وہ چیزیں جو ایک قوم کے لئے مایہ ناز ہو ا کرتی ہیں، صرف اسی ایک فطری ودیعت کا نتیجہ ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے فقدان نے آج مسلمانوں کو پست و ذلیل بنا رکھا ہے اور جس نے ہمارے افراد کے اندر سے وہ چیز چھین لی ہے جو ایک شخص میں خاص اس کی انفرادیت (Individuality) کو بڑے کار لے کر اسے عام سطح سے بلند کر دیتی ہے۔

یاد رکھئے کہ ہمیشہ وہی علم انسان کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو کسی نہ کسی طرح ترقی انسان تک منجر ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک علم اپنے اندر فکر صحیح پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھے۔ چنانچہ یہی وہ راز ہے جس نے آج مغرب کو اس منزل پر پہنچا دیا ہے اور یہی جہل ہے جس نے ہمیں اس کا غلام بنا رکھا ہے۔

اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ، انسانی ضروریات، تمدنی واجبات اور معاشی فرائض بھی بدلتے رہتے ہیں، کیونکہ قیام و بقا کے لئے متضادم قوتوں کا مقابلہ ضروری ہے اور یہ مقابلہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا توازن ہر چیز میں فریق مخالف کے برابر ہو۔ پھر ظاہر ہے کہ جس طرح قدیم توڑیدار

بندوق اب میگزین رائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اسی طرح قدیم علوم سے ہم علوم جدیدہ کو شکست نہیں دے سکتے کیونکہ جنگ میں کامیاب ہونے کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ”الف بالالف“ کا مطالبہ کرنے کی ہم میں قوت موجود ہو۔

اس لئے اگر کسی قوم کو زندہ رہنا ہے تو اسے جلا وطنی کا درس دینا چاہئے اور ان علوم و فنون کو داخل نصاب کرنا چاہئے جو موجود عہد کی تمدنی جنگ میں ہماری بقا و تحفظ کے ضامن ہو سکتے ہیں اب وہ وقت نہیں کہ صرف پڑانے دفتروں کی چھان بین فضل و کمال کا معیار قرار دی جائے، یا قدیم علوم کے قدیم ذخائر میں سر کھپا کر وقت صرف کیا جائے، کیونکہ یہ محض ”گورکھنی“ ہے جس کا نتیجہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ کسی وقت اس ”کاوکا و سخت جانی“ کی بدولت بعض ایرانی لاشوں تک پہنچ کر ان کے وجود کو تاریخ سے ثابت کر سکیں، لیکن اس سے وقت حاضر کے کسی زندہ انسان کو آپ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

اس وقت ترقی کی بے چینی کا یہ عالم ہے کہ اب آگے بڑھنے کے لئے وہ صدی اور قرن کا انتظار نہیں کرتی، بلکہ چند سال کے اندر وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے علم انسانی جس سرعت کے ساتھ متواتر و پیہم قدم آگے کی طرف بڑھا رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، یہاں تک کہ اب مغرب کا انسان، برق و کھربا کے حدود سے آگے گزر کر یہ سوچ رہا ہے کہ ”ماورا اسر حد ادراک“ کو کیونکر قابو میں لایا جائے اور وہ دن دور نہیں جب ”اشعہ کوئیہ“ کی جستجو اس منزل تک بھی پہنچا دے۔

بہر حال اب بچوں کی تعلیم کے لئے کوئی قدیم نصاب تو کسی طرح مفید ہو نہیں سکتا، رہا جدید نصاب جو علوم حکمیہ سے مخفی ہو، سو سو تکمیل کو خیر بڑی چیز ہے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کی بھی اہلیت ہم میں موجود نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جب تک ہم اپنے علم و فضل اور تفوق و برتری کی بنیاد صرف اس پروا لگنا پر قائم کئے ہوئے ہیں کہ سوائے ہمارے تمام عالم غیر مذہب و ناشایستہ ہے اور ہم کو علوم جدیدہ کی طرف سے بالکل بے پروا رہنا چاہئے دنیا میں ہر شخص تارک الدنیا ہو کر صرف روحانی زندگی بسر کرنے کا اہل نہیں ہے اور نہ ہمارے مذہب نے اس طریق حیات کو پسند کیا ہے، اکثر افراد انسانی دنیا میں، دنیا والوں کے ساتھ ہی رہ کر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور یہ نظام تمدن کا اولین اصول ہے کہ جب تک جماعتوں یا افراد کی ذہنی ترقیاں مساوی نہ ہوں گی، فرق مراتب برابر قائم رہے گا اور اسی سے عروج و زوال یا انحطاط و ترقی کی منزلوں میں خط فاصل قائم کیا جاتا ہے پھر اس سے قبل کہ دنیا میں وسائل زندگی و ترقی بہت محدود تھے ہم اپنے حال پر قانع رہ کر زندہ رہ سکتے تھے، لیکن اب کہ علوم جدیدہ نے سارے کمرہ زمین کے باشندوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے اور کوئی ملک اپنے

آپ کو دوسرے ممالک سے مستغنی رکھ کر قائم نہیں رہ سکتا، ہمارے لئے ناکزیر ہے کہ ہم بھی اسی سیلاب میں اپنے آپ کو ڈال دیں اور ساحل تک پہنچنے کے لئے وہی تمام تدابیر اختیار کریں جو دوسری قومیں اختیار کر رہی ہیں۔ اور وہ تدابیر کچھ نہیں ہیں مگر عقلی و ذہنی ترقیان۔ اس لئے آپ بچوں کو جو جی میں آئے پڑھائے، لیکن یہ کبھی نہ بھولے کہ آئندہ چل کر انھیں نہایت سخت کشاکش کی زندگی بسر کرنا ہے اور اس کا مقابلہ کرنیکی اہلیت ان میں شروع ہی سے پیدا کرنا چاہئے۔

رسالہ نگار میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعائر مذہبی و اعمال اللہ تعالیٰ جل شانہ و حضرات انبیاء اکرام علیہم السلام و اصحاب اہل بیت رسالت صلوٰۃ علیہم و آلہم و سلم و دیگر بزرگان دین و آئمہ دین و علمائے سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں ان کو میں اپنے خیال سے اسلام کی خدمت سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے یہ خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منقزل ہوں اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات نہ شائع ہوں گے جن سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہونچا اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار یرأت و استغفار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین استغفر اللہ الذی لا الہ الا هو الٰحی القیوم من کل ذنب و اتوب الیہ و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین و علی جمیع الانبیاء والمرسلین و من اتبعہم احسان لعلہ یوم الدین و الحمد للہ رب العالمین۔

۱۱۔ اکتوبر کے ہمت کے اعلان اور اکتوبر کے نگار میں جو کچھ ملاحظات کے تحت میں چھپا ہے اس کو اعلان معذرت سے قبل لکھنے کے باوجود کالعدم قرار دیتا ہوں کیونکہ اگرچہ وہ معذرت نامہ پر دستخط کرنے سے لکھے گئے تھے، مگر ان کی اشاعت بند کو بھی ہوئی اور اس معذرت نامہ کی روح کی منافی تھی۔ نگار میں آئندہ کسی قسم کا مذہبی مضامین درج نہ کروں گا۔ واللہ علی ما نقول شہید

اعتبارات

محنت و عمل :-

اول اول جب میرے لبوں میں رعشہ نطق پیدا ہوا تو میں جبل مقدس پر گیا اور خدا کو پکارا کہ :-

”اے میرے پالنے والے، میں تیرا بندہ ہوں، تیری مشیت میری زندگی کا قانون

ہے اور تیرے ہی سپرد میری کارگاہ حیات ہے،“

لیکن مجھے خدا نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک آندھی کی طرح سامنے سے گزر گیا

ایک ہزار سال بعد میں پھر جبل مقدس پر گیا اور یوں خطاب کیا کہ :- ”ای خالق، تو نے مٹی سے مجھے بنایا، اپنی

روح پھونک کر مجھے جلایا، پس میں سب کچھ تیری ہی مرضی پر چھوڑتا ہوں،“ لیکن خدا نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور اس

طرح سامنے سے غائب ہو گیا جیسے کوئی ہزاروں پر لگا کر اڑ جائے

ایک ہزار سال اور گزر گئے۔ میں پھر جبل مقدس پر گیا اور میں نے تیسری بار خدا کو مخاطب کر کے کہا کہ :- ”اے میرے

مقدس باپ، میں تیرا محبوب بننا ہوں، محبت و رافت کے ساتھ تو نے مجھے پیدا کیا اور اب طاعت و عبادت ہی کی صورت میں،

اپنے تمام فرائض سپرد کرتا ہوں،“ اب بھی مجھے کوئی جواب نہ ملا اور ایک ہلکے پارہ ابر کی طرح نگاہوں سے غائب ہو گیا

ایک ہزار سال بعد میں پھر جبل مقدس پر گیا اور میں نے چوتھی بار خدا سے کہا کہ :- ”ای خدائے حکیم و دانا، اے میرے کہا

اے میری شاہراہ۔ میں تیرا وہ کل ہوں جو گزر گیا اور تو میرا وہ کل ہے جو آئنا والا ہے۔ میں نے زمین کی تاریکیوں میں تیرے لئے ”عروق“ کا کام

دینا ہوں اور تو آسمان کی روشنیوں میں میرے لئے گل وریاحین ہے۔ کائنات میں ہم اور تو دونوں ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں“

یہ سن کر خدا مجھ پر ابسا ملتفت ہوا کہ بالکل جھاگیا اور میرے کان میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو حد درجہ شیریں تھیں، تنہا

محبت آمیز تھیں اور جس طرح سمندر اپنے اندر گرنے والے دریا کو اپنا ہی ایک جزو بنا لیتا ہے، اس طرح خدا نے مجھے اپنے

اعماق میں لے لیا

پھر اس وقت سے خواہ میں کہیں ہوں، نشیب یا فراز، ہر جگہ خدا میرے ساتھ ہے اور میں اسکے ساتھ۔

ایک بات اور دو تعمیریں :-

ایک صبح پہاڑ کی چوٹی پر یزدان واہرمن کا اجتماع ہوا۔ یزدان نے اہرمن کو مخاطب کر کے کہا ”کیسا مزاج ہے“

اہرمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ یزدان نے کہا ”آج کیسا مزاج بہت مکدر ہے،“ اہرمن نے کہا ”ہاں، میں

ملول ہوں کیونکہ اب انسان کا یہ عالم ہے کہ وہ میرے تیرے درمیان کوئی تمیز ہی نہیں کرتا اور اکثر و بیشتر مجھے تیرے

ہی نام سے پکارتا ہے،

یزدان بولا: ” اے عزیز من، یہی تکلیف مجھے بھی ہے کہ اب لوگ اکثر مجھے تیرے نام سے پکارتے ہیں“ ایک طرف اب ہر من افسردگی کے عالم میں چلا گیا اور دوسری طرف یزدان گردن جھکائے ہوئے۔
سنی و کاوش :-

— قدیم زمانہ میں ایک انسان تھا جس کے پاس سویوں کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا تھا۔

ایک دن یسوع کی ماں اس کے پاس گئی اور بولی —

” اے صاحب، میرے بیٹے کی چادر پھٹ گئی ہے، میں چاہتی

ہوں کہ سیکل میں بھیجنے سے قبل اس کی چادر سی دوں، کیا تم مجھے ایک

سوئی فرض دے دو گے۔“

اس نے سوئی نہیں دی، اور کہا کہ

” بجائے سوئی کے میں ایک ” نصیحت “ دیتا ہوں وہ اپنے

بیٹے کے پاس لیجا قبل اس کے کہ وہ سیکل میں داخل ہو — اور

وہ نصیحت یہ ہے کہ :-

” کوشش کرو اور پاؤ“

نگار کے لئے آپ کیوں اپنا نقصان چاہتے ہیں

اور کیوں نہیں سالانہ چندہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرماتے۔ دیکھئے منی آرڈر اور وی۔ پی دونوں کا حساب ذیل میں درج ہے :-

حساب منی آرڈر	— چندہ سالانہ	۴۰	فیس منی آرڈر	۲	میزان کل	۳۸
حساب وی۔ پی	— چندہ سالانہ	۴۰	مصارف رجسٹری وغیرہ	۲	کمیشن منی آرڈر	۲
					میزان کل	۴۴

اب آپ کو اختیار ہے خواہ ۴۴ دیکھئے یا ۳۸۔ اس ماہ کے ساتھ چونکہ بہت سے حضرات کا چندہ ختم ہو رہا ہے اس لئے ان کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔

منیجر نگار

وطن

بہت عزیز ہے مجھ کو وطن۔ عزیز وطن

وطن کی خاک ہے عنبر۔ مری نگاہوں میں

وطن کے قطرے سمندر۔ مری نگاہوں میں

وطن کے ذرہ ہیں گوہر۔ مری نگاہوں میں

وطن کے خار گل تر۔ مری نگاہوں میں

بہت عزیز ہے مجھ کو وطن۔ عزیز وطن

مری نگاہوں میں۔ وقت ہے طور سینا کی

مری نگاہوں میں۔ وسعت ہے عرش اعلیٰ کی

مری نگاہوں میں۔ عزت ہے ساری دنیا کی

مگر خاک وطن۔ سرمہ چشم بینا کی

بہت عزیز ہے مجھ کو وطن۔ عزیز وطن

بلند رتبہ گردوں سے پائنگاہ وطن

بلند وصلہ دل سے بارگاہ وطن

کلیم دل کے لئے طور جلوہ گاہ وطن

نشاط روح کی ضامن ہے جگہ گاہ وطن

بہت عزیز ہے مجھ کو وطن۔ عزیز وطن

مرے وطن میں ہے۔ گو تم کی خاک نورانی

مرے وطن میں ہے۔ گیتا کا فیض روحانی

مرے وطن میں ہے۔ گنگا کی پاک دامانی

مرے وطن میں ہے۔ نور انزل کی ارزانی

بہت عزیز ہے مجھ کو وطن۔ عزیز وطن

وطن کی گرد۔ وطن کی زمیں۔ وطن کی ہوا

وطن کی شام۔ وطن کی سحر۔ وطن کی فضا

وطن کے کوچے۔ وطن کے چمن۔ وطن کی ادا

ہے یاد ان کی علاج اپنے رنج غربت کا

بہت عزیز ہے مجھ کو وطن۔ عزیز وطن

قیصر

(امراؤتی)

”خدا کی جلوہ گاہیں“

وظائف، شور و حق اور سچہ چھوڑا غافل
سحر خیزی سے حاصل؟ فائدہ شبِ ندری ہی؟
صدائے آواز کی گواہی کو جگمگاتی ہے پتہ
اٹھو اللہ والو! مسجد و مندر، کلیسا سے
خدا ان عافیت گاہوں کو کب مسکن بناتا ہے

جہاں ہنکامے اٹھ کر پیامِ جوش دیتے ہیں
زبانِ حال سے کہتی ہیں نشیں اسے جواں مرد
چراغِ دیدہ بسمل سے اٹھ کر پھیل جاتی ہیں
لقائے روح کا جو خواب جاں بازوں نے دیکھا تھا
وہاں وہ آ کے ان کو فتح کا مرثدہ سناتا ہے

جہاں باوصف خستہ حالی و در ماندہ سلا مانی
حقیقت میں ہیں یہ وہ قوتِ قدرت کے آئینے
جب اک اک بالِ تحریکِ عمل سے تلملاتا ہے
مگر جب ملک کے قزاق آکر لوٹ لیتے ہیں
وہ آکر ان کو رازِ راحت و اطمینان بناتا ہے

جہاں مظلوم انسانوں کی بے تاثیر آہوں پر
نہاں ہوتی ہے فرعونِ جہالت کے اندھیرے
خسوفِ ظلم و استبداد میں پوش ہوئے ہیں
زمین سے چرخِ خاک ہو تا ہے اک تاریک سناٹا
وہ آکر بے کسوں کو جنگ کے قابل بناتا ہے

بلاتا ہے کسے تو صومعہ کی تیرہ خلوت میں
نہ کریوں رایگاں وقتِ عملِ شغلِ عبادت میں
مگر پر آتما کو تو نہیں لاسکتی جلوت میں
کہ یہ سارے مکاں ہیں حلقہٴ آرام و راحت میں
فضا کو مرتعش کرتی ہیں جھنکاروں سے شمشیریں
منور کرد و نورِ عزم سے ملت کی تقدیر میں
ضیائے نصرتِ جاوید کی مسرور تئویریں
فنا کی نیند میں پاتے ہیں مضمحل اس کی تعبیریں
سرورِ بادۂ نصرت سے ہنستی ہے ستم رانی
کلمہ اللہ کے نورِ بصیرت کی درختانی
مہ صبر و تحمل، نیرِ تہذیب انسانی
مسلط جس پہ ہوتی ہے ستم کی حشر سامانی
انظر

حدیث دوست

بزم انجم کی روشنی کی قسم صبح خنداں کی تازگی کی قسم
 آسماں کی نگاہ شاہد ہے قلب گستی کی آہ شاہد ہے
 نصف شب کے سکونِ کامل میں خامشی کے فسونِ کامل میں
 جب جہاں مجھ خواب ہوتا ہے ہر بشر گہری نیند سوتا ہے
 دل میں اٹھتا ہے درد رہ رہ کر ہلکا ہلکا سا ، میٹھا میٹھا سا
 ایک سرد آہ لب پہ آتی ہے روح جیسے زباں ہلاتی ہے
 بے خودی کی عمیق کیفیت رات کی بے پناہ محویت
 روح کو خواب سے جگاتی ہے دوست کی داستاں سناتی ہے
 ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں سے روح کی ان لطیف راہوں سے
 چپکے چپکے گزر کے آتا ہے اور مرے دل میں بیٹھ جاتا ہے

دل کی دھڑکن ہے گفتگو اسکی
 ہر نفس میں نہاں ہے بواہ اس کی

بیان مجبور

واردات

بزم ہستی میں کوئی اس قدر رنجور ہو
داستانِ غم سنانے کیلئے مجبور ہو
جس کی آنکھیں ہوں فوراً سے خونبار
جس کا دل سوز و لواے درد سے نمود ہو
آئے دن گرتی ہوں نا کامی کی جہیزِ جلیاں
جس کی ہر چیز ممکن، سعی نامشکور ہو
رات کو راحت میسر ہو نہ ہو دن کو سکون
زندگی کا جسکی یہ اسلوب یہ دستور ہو
اسکے دل سے پوچھئے، اسکے جگر سے پوچھو
آج جس کی منزل مقصود کل سے دور ہو
بندہ آزاد کی اندر سے مجبوریاں
رخصت فریاد بھی چاہے اتنا منظور ہو
ہو اگر زورِ سحر تیری شب کا مال
یہ سہہ بختی کسی کی دیے ہو
مفت میں ہو کر گناہ بے گناہی کا شکار
کوئی دنیا میں نہ سرت کی طرح مشہور ہو

(عبدالمجید) چہرہ ت (بے)

نہیں ذریعہ تسکین دل یہاں کوئی
کہ میرے نالوں سے ہوتا ہو گدگدائی
ابھی تو لذتِ جور و ستم پہ مرتا ہوں
بڑا غضب ہو جو ہو باے مہرباں کوئی
صدائے نالہ دل کو سمجھ رہا ہوں میں
سنا رہا ہوں تجھے میری داستاں کوئی
جھکی ہوئی ہو جبین نیاز اس در پر
کہ جس کے آگے نہیں اور آستاں کوئی
بہارِ جوشِ جوانی اسی کو کہتے ہیں
اڑا رہا ہے گریباں کی دہجیاں کوئی
یہ لوگ کیوں مری قسمت پہ شک کرتے ہیں
ابھی ہوا ابھی نہیں تجھ پہ مہرباں کوئی
خلیقِ عشق میں حراں کا میں نہیں قائل
نہیں جو آج تو کل ہو گا مہرباں کوئی

خلیق (فیض آبادی)

معلومات

ایک خانہ بدوش عورت کی | ۱۸۴۹ء ہے اور پریشیا کا شاہزادہ ولیم (جو بعد میں

شاہنشاہ ولیم اول کے نام سے مشہور ہوا) صوبہ برلین کے ایک مقام میں بالکل تنہا کسی چشم و چراغ کی طرف سے لپکتے ہی اسے لفظ "شاہ" سے خطاب کرتی ہے۔ یہ حیران رہ جاتا ہے، کیونکہ اس کے بادشاہ ہونے کا نہایت ضعیف امکان تھا اور وہ خود بھی اس کا زبان ولیم نے پوچھا۔ "تو مجھے بادشاہ ہوں گا"۔

جہنمی کی جدید سلطنت قائم ہوگی۔

کاہنہ نے کاغذ کا ایک ورق پھاڑ کر اس پر ۱۸۴۹ء لکھا۔ یعنی وہ سنہ جو اس وقت جاری تھا اور پھر اس کے نیچے وہ ہند سے لکھے جن سے وہ سنہ مرکب ہے یعنی اس طرح ۱۸۴۹ء اور ان کے مجموعہ سے جو ۱۸۴۹ء ہوتا ہے، اس نے اس سلطنت کے قیام کا سنہ ظاہر کیا۔

ولیم نے پوچھا "اچھا یہ بتا کہ میں کتنی مدت تک سلطنت کروں گا" کاہنہ نے اب ۱۸۴۹ء لکھ کر اس کے ہند سے اس کے نیچے لکھے (اس طرح) ۱۸۴۹ء اور اس کے مجموعہ ۱۸۴۹ء سے ولیم کے اختتام حکومت کا سال بتا دیا۔

ولیم نے دریافت کیا "یہ جدید شاہنشاہیت کب ختم ہوگی" کاہنہ نے پھر ۱۸۴۹ء لکھ کر اس کے نیچے اس کے ہند سے مثل سابق جمع کئے اور اس طرح ۱۸۴۹ء میں اس سلطنت کا ختم کی پیشین گوئی کی۔

چنانچہ یہ امر حیرت سے دیکھا جائیگا کہ پہلی دو پیشین گوئیاں تو بالکل صحیح نکلیں کیونکہ وہ ۱۸۸۶ء میں تحت نشین ہوا اور ۱۸۸۷ء میں مرا۔

اور سولہویں صدی میں مرا۔
جنگ بجائے سولہویں صدی کے شروع ہوئی جس نے آخر کار نظام سلطنت کو ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔ اس
لئے تیسری پیشین گوئی میں غلطی تو ہوئی لیکن صرف ایک سال کی

لئے تیسری پیشین گوئی میں غلطی تو ہوئی لیکن صرف ایک سال کی
پانسو روپیہ کا ترہ روزا ۱۹۹۸ء میں جب جنگ اسپین کے سلسلہ میں امریکہ کی بعض افواج مصروف تھیں، تو چند
سپاہیوں نے فلوریڈا کے کسی ترہ فروش سے ایک ترہ روز لیکر کھایا جس کی قیمت ادا نہیں کی گئی بلکہ اسے ۲۲ سال کے بعد حکومت امریکہ
نے اس کی قیمت مع نفع کے ۱۵۰ ڈالر (یا پانسو روپیہ) دیا جانا تجویز کیا۔ تحقیق سے معلوم کہ یہ ہوا کہ وہ شخص تو مر گیا ہے لیکن اپنے
واو لا چھوڑ گیا ہے اس لئے ڈھائی سو روپیہ فی کس ان کو دے دئے گئے جو روستہ
بہت کھلوں کو بغیر کسی دوا

واولاً چھوڑ گیا ہے اس لئے ڈھائی سو روپیہ فی کس ان کو دے دئے لئے چار سو روپیہ
سوف کی حالت میں اگر معنی کے ایک شخص نے ایک طریقہ نکالا ہے جو
 حرارت سردی کی مدد کے سوف میں تبدیل کر سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کا مزہ اور رنگ
 کوئی دیر نہیں لگتی اور چند منٹ میں یہ سوف تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر یہ طریقہ عام ہو گیا تو پھلوں کی حفاظت
 کا کام آئے گا۔

کوئی دیر نہیں لیتی اور چند منٹ میں یہ سٹوف تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں کھانے کی چیزیں بھی شامل ہیں۔
 پوری طرح ہو سکے گی اور پختہ پھلوں کا قیام عرصہ تک ممکن ہو جائے گا۔ یہی امر جبکہ
 نم ۱۴ ہزار بچوں کا باب | جرمنی کے رئیس جمہوریت ان ہینڈ ہینرگ کا دستہ
 دیتا ہے جس میں ساتویں اولاد زینہ پیدا ہوئی ہو۔ اس وقت تک... ہا خاندان برکن میں جوانی
 اس خاندان کے لیے ہیں اور اس طرح کہ باوہ چودہ ہزار بچوں کا باب تسلیم کیا جاتا ہے۔
 غرض یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

دینا ہوں میں ساتویں اور وہ ایک پیر ہے۔
 انہی خدایانِ عظیم کی ہیں اور اس طرح گویا وہ چودہ ہزار بچوں کا باپ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ازار
 کے بڑھانے کا اور سچلہ ان جذبات کے جو اس وقت خرمی کی ترقی کے لئے اکابر ملک کے دلوں میں شک و شبہ کی موج
 سا کھڑا روپیہ فی لفظا حال ہی میں نیویارک کی ایک صحافی کمپنی نے مارشل فوش کی ڈائری کے حقوق اشاعت
 ۵ لاکھ فرانک میں خرید لئے ہیں۔ اسی طرح مارشل برٹنگ کی ڈائری کا جو معاوضہ دیا ہے وہ ۱۰۰ فرانک یا تقریباً ساٹھ
 روپیہ فی لفظ ہوتا ہے۔ یہ ہے مغرب کی وہ اکابر پرستی جس نے ملک کے اندر نہضت و ارتقاء کی روح پھونک دی ہے اور
 جس کی بدولت ہر شخص جذبہ تفوق سے سرشار ہو کر والہانہ طور پر اپنی تمام قوتیں ملک و قوم کی خدمات کے لئے وقف کئے ہوئے ہے

کھڑا۔ اگر آپ واقف

برائے کرم فیصلہ کی خانہ پُری فرما کر جلد از جلد دفتر نگار میں بھیج دیجئے۔ اگر آپ واقعی

اس کی خدمات کو قابل تحسین جانتے ہیں

شیخ زنگار

فقد

مولانا شبلی

سیرۃ ابنی جلد اول

دم

سوم

افراد حق

سیرۃ النعمان

الغزالی

المامون

سوانح نوحہ نادرہ

سفر نامہ مصر و شام

اسلم الکلام

الکلام

رسائل شبلی

مقالات شبلی

شعر انجم جلد اول

دم

سوم

چارم

پنجم

لازمۃ النسخ دیر

معدن عالمگیر

آغاز اسلام

کلیات فارسی شبلی

کلام شبلی اردو

شہنشاہ سرشار

مبارک

مثنوی سجاد حسین

اصح الذی

عاجی بنوول

بیاری دنیا

کایا پلٹ

سنگی پھری

عبداللہ لوندہ

طلسی فانوس

جوالا پر شاہ برقی

مرنائی

مار آستین

بنگالی دولہن

مستوحہ فرنگ

پر تاب

روہنی

مولانا شرم مرحوم

عینہ بغدادی

ملک زونہ

قرۃ العین

مخدرات

جویا سہتی

عفت چین

فلج و مفتوح

بابک خری

القاسو

میتا بازار

نہیں نازیں

لکبری

شو تین

منصور موہنا

حسن انجیلنا

فردوس برین

حسن کا داکو

در بار حرام پور

غیبان دولہن

بدالنسا کی معیت

سیوہ تلخ

نیکی کا پھل

شوق قدوائی

ترانہ شوق

قاسم وزہرہ

تیز نگہ حال

ظفر عمر بی

چورول کا کلب

شبلی بھتری

بہرام کی گرفتاری

وکیل کی جاسوسی

شعلہ رنگین

محاصرہ پیرس

شیخ علی

خطی جاسوس

ٹرکی حرم سرا

جنگ طرابلس

بہرام چور

زہرست

بجی کاراز

عبدالرحمن ناصر

عردس پور

باب خون

سیاحت زمین

سیاحت ہوا

نازنین مراکش

سمندر کی سیر

اسرار بالشویرم

روح یلی

ایین بک

حجاج بن یوسف

یوسف پاشا

انقلاب عثمانی

بہرام کی رہائی

بہرام کی آزادی

بہرام کی سرگزشت

لال کھنور

پراسرار قتل

ادنی کسانیں

یسی مجنوں ڈراما

مرانی

مرانی دبیر

مرانی انیس

مرانی ضمیر

مرانی مونس

مرانی دلگیر

تذکرۃ الشعراء

تذکرۃ کا حسینی

گلشن

سرایا سخن

سوانح نظیر اکبر آبادی

دواوین فارسی

دیوان شمش تبریزی

کلیات عراقی

دیوان حافظ

دیوان بیدل

دیوان عرفی

کلیات جامی

کلیات غائب

کلیات صائب

دیوان ناصر علی

کلیات سعدی

کلیات خزین

دیوان غفری

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

کارخانہ عالم

رنالہ ترکے ناولوں

کے ترجمے

الہ دین دلیلی

فریب حسن

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

کارخانہ عالم

رنالہ ترکے ناولوں

کے ترجمے

الہ دین دلیلی

فریب حسن

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

کارخانہ عالم

رنالہ ترکے ناولوں

کے ترجمے

الہ دین دلیلی

فریب حسن

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

کارخانہ عالم

رنالہ ترکے ناولوں

کے ترجمے

الہ دین دلیلی

فریب حسن

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

کارخانہ عالم

رنالہ ترکے ناولوں

کے ترجمے

الہ دین دلیلی

فریب حسن

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

کارخانہ عالم

رنالہ ترکے ناولوں

کے ترجمے

الہ دین دلیلی

فریب حسن

دیوان ناسخ

کلیات میر

کلیات سودا

کلیات انشا

کلیات نظیر اکبر آبادی

گلزار داغ

دیوان رند

دیوان ذوق

کلیات اسماعیل

مراۃ الغیب

صنعتی عشق

فریاد داغ

دیوان قاتل

دیوان شمشیری

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات

لقدیر یگین

در با تصویر سادہ

مجمع الفنون

طلم فرنگ

11-2

ذیل کی کتابیں نگارک مکتبہ سے طلب فرمیں۔

رجسٹرڈ نمبر ۱

11-2

ففي رسالة "فكار لکھنؤ"

لے کر منتظر رہے۔ دریں نیا گاؤں کو منقہ بہ تمام یہ توکل حسین